دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی ودینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۸۷ ماہ جمادی الثانی ۱۴۳۲ھ مطابق ماہ مئی ۲۰۱۱ء عدد ۵

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

کیمپ ڈیوڈ معاہدہ اور اس کے نتیجہ میں مصر اور اسرائیل کے درمیان ہونے والے امن معاہدہ کے تباہ کن اثرات کا اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ البتہ اس سے اسرائیل کو جو فائدے حاصل ہوتے ان کا اندازہ کرنے کے لیے کسی خاص ژرف نگاہی کی ضرورت نہیں ہے، ایک ایسے ملک کو جسے عالم عرب میں ایک خاص مقام حاصل تھا اور جو نہ صرف خطہ بلکہ دنیا کے مسائل میں نہایت اہم کردار ادا کرتا رہا تھا، اس معاہدہ کے ذریعہ اتنا الگ تھلگ کردیا گیا کہ عالمی اور خطے کی سیاست میں اس کا کوئی کردار باقی نہیں رہ گیا اور وہ محض اسرائیل کا آلہ کار بن کر رہ گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اسرائیلی مفادات کی پاسبانی اور پاسداری میں کبھی کبھی مصر اسرائیل سے بھی آگے بڑھ جاتا تھا۔ گذشتہ چار سال سے غزہ کے باشندے جس اذیت ناک صورت حال سے دوچار ہیں اس میں مصر کا حصہ کسی طرح اسرائیل سے کم نہیں۔ اگر رفح کی گذرگاہ کھلی رہی ہوتی تو اسرائیل غزہ کو ایک وسیع جیل میں تبدیلی کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا تھا۔ اس خطہ کے ممالک کے لیے صہیونی منصوبہ بندی کا ایک اہم حصہ یہ رہا ہے کہ ان کے درمیان افتراق اور نفرت و عداوت کو اس طرح فروغ دیا جائے کہ اتحاد فکر و عمل کی کوئی صورت باقی نہ رہ جائے۔ لیکن صہیونیوں اور ان کے حلیفوں نے اسرائیل کے وسیع تر مفادات کے تحفظ کے لیے جو طویل المیعاد منصوبہ ترتیب دیا تھا عالم عرب خصوصاً مصر میں رونما ہونے والی انقلابی تبدیلیوں کے زیر اثر اس کے تار و پود بکھر رہے ہیں۔ اس نئی صورت حال نے صہیونیوں کے لیے سنگین مسائل کھڑے کردئے ہیں۔ اس کا کسی قدر اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ماضی میں خطہ میں ان کے سب سے قابل اعتماد حلیف مصر کی صورت حال یکسر تبدیل ہوچکی ہے۔ مصری عوام کی غالب اکثریت اس تعلق کو مسترد کرتی ہے اور اسرائیل کے ساتھ کیے گئے معاہدوں کو منسوخ کرنے کے حق میں ہے۔ ان کی تمام تر ہمدردیاں مظلوم فلسطینی عوام کے ساتھ ہیں۔ مصری عوام کی پہلے بھی یہی رائے تھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان کو پہلی مرتبہ اپنے جذبات کے اظہار کی آزادی ملی ہے۔ اس کے اثرات کو موجودہ حکومت کی پالیسیوں اور ترجیحات میں واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس عبوری دور میں بھی مصر کی موجودہ حکومت نے مسئلہ فلسطین کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر اس کی طرف فوری توجہ کی ناگزیر ضرورت کا احساس کیا۔ مصری حکمراں بجا طور پر اس

نتیجہ پر پہنچے کہ جب تک مختلف فلسطینی دھڑوں میں اتحاد واتفاق کی کوئی صورت نہ پیدا ہوگی اس وقت تک اس محاذ پر کسی بھی طرح کی پیش رفت کی توقع عبث ہے۔ چنانچہ ان کی کوششوں کے نتیجہ میں اوران کی سرپرستی اور نگرانی میں اسی مہینہ کے ابتدائی دنوں میں فلسطینیوں کے دونوں متحارب گروہوں فتح اور حماس کے درمیان ایک تاریخی سمجھوتے پر اتفاق ہوگیا ہے اور قاہرہ میں محمود عباس اور خالد مشعل نے اس پر دستخط کردئے۔ ۲۰۰۶ کے انتخابات میں حماس نے پارلیمنٹ میں واضح اکثریت حاصل کرلی تھی۔ لیکن امریکہ، اسرائیل اور مصری آمر حسنی مبارک کے زیراثر فتح نے اسے قبول نہیں کیا، ۲۰۰۷ میں ایک خوں ریز تصادم کے بعد حماس نے غزہ پر تسلط حاصل کرلیا۔ چنانچہ عملاً فلسطین دو حصوں میں بٹ گیا۔ مغربی کنارہ پر محمود عباس کی قیادت میں فتح کی حکومت قائم ہوگئی جب کہ غزہ حماس کے زیر اقتدار رہا۔ امریکہ، اسرائیل اور یوروپ نے فتح کی سرپرستی کی اور حماس کو دہشت گرد قرار دیا۔ اسی وقت سے اسرائیل نے مصر کی مدد سے غزہ کا محاصرہ کررکھا ہے۔ اس خانہ جنگی کا بھرپور فائدہ اسرائیل کو پہنچا۔ فلسطین کے دونوں حصوں میں اس معاہدہ کا جس والہانہ انداز میں استقبال کیا گیا ہے اس سے واضح ہے کہ یہ فلسطینی عوام کی خواہشات اور امنگوں کے عین مطابق ہے۔ مغربی کنارہ اور غزہ میں اتحاد کے لیے عوامی حمایت کے علاوہ عرب دنیا کی بدلتی ہوئی صورت حال کے پس منظر میں کئی اور اسباب وعوامل نے اس سمجھوتہ کی راہ ہموار کرنے میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ ان میں سب سے اہم انقلاب کے بعد مصر کی بدلی ہوئی صورت حال ہے۔ حماس کے خلاف محمود عباس کو حسنی مبارک کی بھرپور حمایت حاصل تھی، دونوں حماس کے اقتدار کا خاتمہ چاہتے تھے اور اس ''کارخیر'' میں ان کو امریکہ اور اسرائیل کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ اب یہ صورت یکسر بدل چکی ہے، اسی طرح خطہ میں شام حماس کا ایک اہم حلیف تصور کیا جاتا تھا۔ اب شام کے غیریقینی حالات کی وجہ سے وہ صورت باقی نہیں رہی۔ امن مذاکرات کی ناکامی اور مقبوضہ علاقوں خصوصاً یروشلم میں یہودی آبادکاری میں مسلسل توسیع کے باعث بالآخر محمود عباس کو غالباً یہ سوچنے پر مجبور ہونا پڑا کہ امن مذاکرات محض ایک بھونڈا مذاق ہیں اور ان سے کسی مثبت نتیجہ کی توقع عبث ہے۔ کسی بھی مصالحت کی کوشش میں کمزوری کی پوزیشن میں رہتے ہوئے منصفانہ حل کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ تقدیر کے قاضی نے بھی جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات ہی تجویز کی ہے۔ چنانچہ اس پوری صورت حال سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ فلسطین کا حتمی حل دراصل فلسطینی عوام کے اتحاد واتفاق میں مضمر

ہے، اسے بزور قوت حاصل کرنا ہوگا۔ یہ بھیک میں ملنے والی چیز نہیں ہے، ساتھ ہی دنیا نے یہ بھی دیکھ لیا کہ ہر ممکن کوشش اور ایک طویل اور تباہ کن جنگ کے باوجود حماس کے وجود کو ختم نہیں کیا جاسکا۔ اہم بات یہ ہے یہ مصالحت امریکہ اور اسرائیل کی اجازت کے بغیر اور ان کی خواہشات کے خلاف انجام پائی ہے ۔یہی وجہ ہے کہ دونوں نے اس پر نہایت تلخ اور تند ردعمل کا اظہار کیا ہے۔

اس معاہدہ کی تفصیلات ابھی واضح نہیں ہیں۔ پہلے مرحلہ میں ایسے ماہرین پر مشتمل قومی مفاہمتی حکومت تشکیل دی جائے گی جو کسی بھی پارٹی سے وابستہ نہ ہوں۔اس عبوری حکومت کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ ایک سال کے اندر پارلیامنٹ کے انتخابات کرائے۔ ابھی تک یہ معلوم نہیں ہے کہ دونوں پارٹیوں کے درمیان پائے جانے والے سیاسی اور نظریاتی تضادات کو کس طرح حل کیا جائے گا۔قیدیوں کی رہائی کی کیا صورت ہوگی۔عباس محمود کی حکومت میں سیکوریٹی کا پورا ڈھانچہ امریکہ اور اسرائیل کی نگرانی میں حماس کے خلاف استعمال کرنے کے لیے تیار کیا گیا۔اب اس کی تشکیل جدید کی کیا صورت ہوگی۔فتح سیکولرازم میں یقین رکھتی ہے جب کہ حماس کی نظریاتی جڑیں اسلام پسندی میں پیوست ہیں ۔ فتح اسرائیل کو تسلیم کرتی ہے جب کہ حماس اس کا وجود تسلیم نہیں کرتی اور اس کو صفحۂ ہستی سے مٹادینے کا عزم رکھتی ہے۔اس طرح کے کئی اور مسائل ہیں جن کا حل آسان نہیں ہے۔توقع کی جانی چاہیے کہ عرب دنیا کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات اور اسرائیل کے ساتھ کسی آبرومندانہ مفاہمت سے مکمل مایوسی اس معاہدہ کی تنفیذ کی راہ کو آسان بنانے کا کام کریں گی۔اس مفاہمت کو ممکن بنانے میں مصر کے وزیر خارجہ نبیل العربی کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔اب وہ عرب لیگ کے جنرل سکریٹری ہیں۔اپنی اس نئی حیثیت میں وہ اس مفاہمت کو کامیاب بنانے میں نہایت اہم کردار ادا کرسکتے ہیں۔محمود عباس یہ اعلان کرچکے ہیں کہ وہ اب صدارتی انتخابات میں امیدوار نہیں ہوں گے ۔ ساتھ ہی یہ ان کی بڑی آرزو ہے کہ فلسطین کے سیاسی منظرنامہ سے ہٹنے سے پہلے وہ کوئی ایسا کام کرجائیں جس کے لیے ان کو یاد رکھا جائے۔اسرائیل اور امریکہ کی مدد سے کوئی ایسا کارنامہ انجام دینا ممکن نہیں ہے۔اب صرف ایک ہی راستہ باقی رہ گیا ہے کہ ستمبر میں وہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے ذریعہ ایک آزاد فلسطینی ریاست کے قیام کی یک طرفہ تجویز منظور کرانے کی کوشش کریں اور یہ متحدہ فلسطین کے بغیر ممکن نہیں۔

مقالات

ابن نفیس کا رسالۂ کاملیہ

تعارف و تجزیہ

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

سیرت نگارانِ رسولؐ کی صف میں شامل ہونا ایک مسلمان کے لیے سعادت کی بات ہے۔اسی لیے فن سیرت پر کثرت سے کتابیں لکھی گئیں اور مختلف پہلوؤں سے جدت طرازیاں کی گئی ہیں۔چنانچہ اس فن میں ضخیم اور مفصل کتابیں بھی ہیں اور مختصر بھی۔بڑوں کے لیے،بچوں کے لیے،تحقیقی اسلوب میں اور عوام کے استفادہ کے لیے ہلکے پھلکے اور عام فہم اسلوب میں،علمی طرز پر اور ناول کے طرز پر۔پھر بھی مولفین سیرت کی طبیعتیں سیر نہیں ہوتیں اور وہ سیرت نگاری کے نئے نئے پہلوؤں کی تلاش میں لگے رہتے ہیں۔اسی طرح کی ایک کتاب،جو ساتویں صدی ہجری / تیرہویں صدی عیسوی میں سیرت نبویؐ کے موضوع پر عام اور روایتی ڈگر سے ہٹ کر لکھی گئی تھی،"الرسالة الكاملية فی السيرة النبوية" ہے،جس کے مصنف تاریخ اسلام کے زریں دور کے نامور طبیب علامہ ابن نفیس قرشی ہیں۔

ابن نفیس-مختصر احوالِ زندگی: ابن نفیس کا پورا نام علاؤالدین ابوالحسن علی بن ابی الحزم القرشی الدمشقی الشافعی ہے۔ان کا آبائی وطن ماوراء النہر کے علاقے میں قَرَش نامی ایک قریہ تھا۔دمشق میں ۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء میں ان کی ولادت ہوئی،وہیں پرورش پائی اور ابتدائی زندگی گزاری۔یہ سلطان صلاح الدین ایوبی (م ۵۸۹ھ/۱۱۹۳ء) کے بھائی الملک العادل سیف الدین ایوبی (م ۶۱۵ھ/۱۲۱۸ء) کا عہد حکومت تھا۔ابن نفیس نے اپنے وقت کے نامور علماء سے مختلف علوم وفنون حاصل کیے۔پھر طب کی تعلیم مہذب الدین الدخوار (م ۶۲۸ھ/۱۲۳۰ء) اور عمران الاسرائیلی (م ۶۳۷ھ/

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی،علی گڑھ۔

۱۲۳۹ء) جیسے حاذق اطباء سے حاصل کی جو نورالدین محمود زنگی (م ۵۶۹ھ/۱۱۷۴ء) کے قائم کردہ اسپتال "بیمارستان نوری" سے وابستہ تھے۔ ۶۳۳ھ/۱۲۳۵ء کے آس پاس وہ قاہرہ چلے گئے جہاں بیمارستان ناصری سے وابستگی اختیار کرلی۔ اس اسپتال کو سلطان صلاح الدین ایوبی نے ۵۷۷ھ/۱۱۸۱ء میں قائم کیا تھا۔ ابن نفیس نے اس اسپتال میں عرصہ تک علاج معالجہ کی خدمت انجام دی۔ بعد میں ان کو اس کے قسم الکحالۃ (شعبۂ امراض چشم) کا سربراہ بنادیا گیا۔ ۶۸۲ھ/۱۲۸۴ء میں جب سیف الدین قلاوون المنصور (م ۶۸۹ھ/۱۲۹۰ء) نے "بیمارستان منصوری" قائم کیا تو ابن نفیس کو اس کا "رئیس الاطباء" (نگران اعلیٰ) بنادیا۔ وہ علاج معالجہ کے علاوہ طبی تعلیم و تدریس کی خدمت بھی انجام دیتے تھے۔ چنانچہ بہت سے طلبہ نے میدان طب میں ان سے اکتساب کیا۔

علامہ ابن نفیس کو طب کے علاوہ دیگر علوم میں بھی مہارت حاصل تھی اور وہ ان میں دوسروں کو فیض پہنچاتے رہتے تھے۔ چنانچہ قاہرہ کے مدرسۂ مسروریہ میں جسے صلاح الدین ایوبی کے ایک معتمد مسرور شمس الغواصی نے قائم کیا تھا، وہ فقہ شافعی کا درس دیتے تھے، مشہور مفسر اور نحوی ابوحیان الاندلسی (م ۷۴۵ھ/۱۳۴۴ء) بیان کرتے ہیں کہ "ہمارے استاذ (ابن نفیس) کو منطق میں مہارت حاصل تھی، اس میں انہوں نے ایک مختصر کتاب تصنیف کی تھی اور میں نے ان سے ابن سینا کی کتاب الهداية فی المنطق پوری پڑھی تھی"۔

ابن نفیس کے معاصرین میں مشہور ماہر نباتات ضیاء الدین ابن بیطار (م ۶۴۶ھ/۱۲۴۸ء) السدید الاسرائیلی (م ۶۳۶ھ/۱۲۳۸ء) اور رشید الدین ابن ابی حلیقہ (م ۶۶۰ھ/۱۲۶۲ء) اور تلامذہ میں ابن فضل اللہ العمری (م ۷۴۹ھ/۱۳۴۹ء) السدید الدمیاطی الحکیم، ابوالفرج السکندری، ابوالفرج بن صغیر، بدر الدین حسن الرئیس، ابن البرہان الجرائحی اور امین الدولۃ ابن القف (م ۶۷۵ھ/۱۲۸۶ء) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان کے گھر میں روزانہ علمی مجلس جمتی، جس میں حکمراں طبقہ کے ممتاز افراد، علماء، اطباء اور شاگردوں کی بڑی تعداد اکٹھا ہوتی تھی۔

وہ بڑے متقی اور پرہیزگار انسان تھے۔ مرض وفات میں بعض دوستوں نے کچھ شراب پی لینے کا مشورہ اس لیے دیا کہ اس سے کچھ افاقہ ہوجائے گا، مگر انہوں نے سختی سے انکار کیا اور فرمایا: "میں اللہ تعالیٰ سے اس حال میں نہیں ملنا چاہتا کہ میرے پیٹ میں شراب کا کوئی حصہ ہو"۔

ان کی ذاتی لائبریری میں مختلف علوم وفنون کی قیمتی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا۔ بیمارستان منصوری قائم ہونے کے بعد انہوں نے نہ صرف اپنی یہ لائبریری بلکہ اپنا گھر اور زمین جائیداد سب اس کے لیے وقف کردی۔ انہوں نے شادی نہیں کی تھی۔ اسّی سال کی عمر میں ۶۸۷ھ/ ۱۲۸۸ء میں وفات پائی۔(۱)

علمی مقام ومرتبہ: علامہ ابن نفیس کو مختلف علوم وفنون اور خاص طور پر طب میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ چنانچہ ان کے معاصرین اور بعد کے سوانح نگاروں نے انہیں زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے اور ان کے علم وفضل کو سراہا ہے۔ سطور ذیل میں چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔

مشہور مورخ طب ابن ابی اصیبعہ (م ۶۶۸ھ/۱۲۷۰ء) جو ان کے رفیق درس اور بعد میں ان کے رفیق کار بھی رہے، رقم طراز ہیں:

> ''وہ فضل وکمال کے بلند مقام پر تھے، ان کی مثال علوم کے بے پایاں سمندر اور بلند پہاڑ کی تھی۔ انہوں نے القانون کے غوامض کی شرح کی ہے، اگر انہوں نے اس کے علاوہ کوئی دوسرا علمی کام نہ کیا ہوتا تو صرف یہی ان کے انتہائی فضل اور ان کی انفرادیت کی دلیل ہوتا، لیکن اس کے علاوہ بھی تمام اقسام علوم میں ان کی بہت سی تصانیف ہیں جو بہت سے علاقوں میں محققین کے نزدیک مقبول ہیں۔ یہ تصانیف غور وفکر پر مبنی حقائق و دقائق، لطیف اشارات اور خوب صورت تحریروں پر مشتمل ہیں''۔(۲)

ابوحیان الاندلسی فرماتے ہیں:

> ''وہ علم طب کے امام اور یکتائے روزگار تھے، اس میں قدماء کے افکار و نظریات سے استحضار اور دقائق ونکات کے استنباط کے معاملے میں کوئی نہ ان کا مثل تھا، نہ مدمقابل، نہ قریبی حریف''۔(۳)

مشہور مورخ اسلام شمس الدین ذہبی (م ۷۴۸ھ/۱۳۴۸ء) نے لکھا ہے:

> ''وہ اپنے زمانے کے شیخ الاطباء تھے، انہیں سرزمین مصر میں طب کی سربراہی حاصل تھی۔ ان کے بعد ان جیسا کوئی نہ پیدا ہوا''۔(۴)

متعدد سوانح نگاروں مثلاً یافعی (۷۶۸ھ/۱۳۶۷ء)، سیوطی (م ۹۱۱ھ/۱۵۰۵ء) اور

ابن العماد (م ۱۰۸۹ھ/۱۶۷۹ء) نے ان کے علم وفضل کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''وہ سرزمین مصر کے بڑے طبیب اور صاحب تصانیف بزرگ تھے۔ان کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جنہیں طب پر ماہرانہ دست رس تھی۔وہ انتہائی قوی حافظہ اور غیر معمولی ذہانت کے مالک تھے۔فقہ،اصول فقہ،حدیث،عربی زبان اور منطق میں بھی وہ درک رکھتے تھے''۔(۵)

تاج الدین السبکی نے لکھا ہے:

''جہاں تک طب کا تعلق ہے اس میں ان کی جیسی مہارت اس زمانے میں کسی کو حاصل نہ تھی۔ابن سینا کے بعد ان جیسا طبیب پیدا نہیں ہوا اور علاج معالجہ کے معاملے میں انہیں ابن سینا پر برتری حاصل تھی''۔(٦)

الاسنوی (م ۷۷۲ھ/۱۳۷۰ء) فرماتے ہیں:

''اپنے فن (یعنی طب) میں وہ مشرق ومغرب میں اپنے وقت کے امام تھے۔ان کا کوئی مدمقابل نہ تھا،وہ اپنے زمانے کے عجوبۂ روزگار تھے۔انہوں نے فقہ، اصول فقہ،عربی زبان،علم کلام اور معانی و بیان میں کتابیں تصنیف کی ہیں۔ان کے تلامذہ مختلف علاقوں میں پھیل گئے''۔(۷)

ابن تغری بردی (م ۸۷۴ھ/۱۴۷۰ء) نے لکھا ہے:

''وہ حکیم،فاضل،اپنے فن میں علامہ تھے۔ان کے زمانے میں علاج معالجہ کے میدان میں کوئی ان کا ہم سر نہ تھا۔انہیں اپنے زمانے میں فن طب میں سربراہی کا مقام حاصل تھا۔وہ متعدد مفید کتابوں کے مصنف ہیں''۔(۸)

طب کے علاوہ فقہ میں بھی علامہ ابن نفیس کو درجۂ کمال حاصل تھا۔ان کی عظمت کا ثبوت یہ ہے کہ مشہور مورخ اور سوانح نگار تاج الدین السبکی (م ۷۷۱ھ/۱۳۷۰ء) نے ان کا شمار اکابر فقہائے شوافع میں کیا ہے۔ان کی تصنیف طبقات الشافعیة الکبری میں ابن نفیس کا تذکرہ شامل ہے۔ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''وہ مسلک شافعی کے فقیہ تھے، انہوں نے اصول فقہ اور منطق میں کتابیں تصنیف کی ہیں،خلاصہ یہ کہ انہیں مختلف علوم وفنون میں دست رس حاصل تھی''۔(۹)

دورانِ خون رئوی کا محقق: اپنی ایک تحقیق کی وجہ سے طب کی تاریخ میں علامہ ابن نفیس کا نام سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ اس تحقیق کو طبی اصطلاح میں دوران خون رئوی (PULMONARY BLOOD CIRCULATION) یا دوران خون اصغر (LESSER BLOOD CIRCULATION) کا نام دیا گیا ہے۔ اطبائے قدیم یہ سمجھتے تھے (جیسا کہ جالینوس (م ۲۰۰ء) نے خیال ظاہر کیا تھا اور اسی کو الشیخ الرئیس ابن سینا (م ۴۲۸ھ/۱۰۳۷ء) نے بھی دہرایا) کہ قلب کے دونوں بطون (بطن ایمن اور بطن الیسر) کے درمیان ایک آڑ ہوتی ہے، جسے حجاب حاجز کہتے ہیں، اس میں مسامات ہوتے ہیں، جن کے ذریعے خون بطن ایمن سے بطن الیسر میں پہنچتا ہے اور وہاں پھیپھڑوں سے آنے والی ہوا میں اس کی آمیزش ہوتی ہے۔ اسے وہ روح حیوانی کا نام دیتے تھے۔ ابن نفیس نے پورے یقین کے ساتھ اور قطعی الفاظ میں اس کی تردید کی اور کہا کہ دونوں بطون کے درمیان پایا جانے والا حجاب بہت کثیف ہوتا ہے، اس میں کسی طرح کے مسامات نہیں ہوتے کہ ان سے خون آر پار ہو سکے، بلکہ وہ قلب کے بطن ایمن سے ورید شریانی کے ذریعے پھیپھڑے میں پہنچتا ہے، جہاں ہوا کی آمیزش سے اس کی صفائی ہوتی ہے، پھر وہاں سے وہ شریان وریدی کے ذریعے قلب کے بطن الیسر میں پہنچتا ہے، جہاں سے جملہ اجزائے بدن میں اس کی ترسیل ہوتی ہے۔

یورپ میں یہ تحقیق سولہویں صدی عیسوی میں عام ہوئی۔ سب سے پہلے میگل سرویٹو MIGUEL SERVETO (م ۱۵۵۶ء) نے ۱۵۵۳ء میں اپنے ایک تحقیقی مقالہ میں قلب اور پھیپھڑوں کے درمیان خون کی رگوں کا انکشاف کیا۔ اس کے بعد ریالدو کولمبس REALDO COLOMBO (م ۱۵۵۹ء) نے تشریح (ANATOMY) پر اپنی کتاب میں دوران رئوی کا تذکرہ کیا۔ آخر میں ولیم ہاروے (W. HARVEY) نے ۱۶۲۲ء میں اس نظریہ کو قطعی شکل دی اور تفصیل سے اس کو پیش کیا۔ اسی بنا پر اسے دورانِ خون رئوی کا محقق قرار دیا جانے لگا۔ حالاں کہ یہ تحقیق اس سے تین سو سال قبل ابن نفیس کے ذریعے پیش کی جا چکی تھی۔ ابن نفیس کی اس تحقیق کا علم دنیا کو مصری طبیب ابراہیم التطاوی کے اس تحقیقی مقالہ سے ہوا جسے انہوں نے جرمنی کی ہائڈل برگ یونیورسٹی میں ڈاکٹر آف میڈیسن کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے ۱۹۲۴ء میں پیش کیا تھا۔ (۱۰)

تصنیف و تالیف: علاج معالجہ اور تعلیم و تدریس کے علاوہ علامہ ابن نفیس کا ایک دلچسپ

مشغلہ تصنیف وتالیف کا تھا۔ وہ قدماء کی کتابوں کے مطالعہ کے بہت شوقین تھے۔ ان کی ذاتی لائبریری میں مختلف علوم وفنون کی قیمتی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا۔ ان کے مطالعہ کے ساتھ وہ اپنے طبی تجربہ اور مریضوں کے مشاہدہ کی روشنی میں ان کا تنقیدی جائزہ لیتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے جالینوس، ابن سینا اور دیگر اطباء اور اصحاب علم کی بہت سی آراء پر تنقید کی ہے۔

سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ ابن نفیس تصنیف وتالیف کے دوران کتابوں کو اپنے پیش نظر نہیں رکھتے تھے، بلکہ اپنے حافظہ کی بنیاد پر لکھتے یا املا کراتے تھے۔ حافظ ابن کثیرؒ (م ۷۷۴ھ/ ۱۳۷۳ء) فرماتے ہیں:

"وہ اپنے حافظہ سے کتابیں تالیف کرتے تھے"۔ (۱۱)

ذہبیؒ نے لکھا ہے:

"انہیں اپنے فن پر اس قدر دست رس تھی کہ اپنی تصانیف حافظہ سے املا کراتے تھے، کتابوں کی طرف رجوع کرنے کی انہیں ضرورت نہیں پڑتی تھی"۔ (۱۲)

موجودہ دور کے محقق خیر الدین الزرکلی (م ۱۳۹۶ھ/ ۱۹۷۶ء) لکھتے ہیں:

"ان کا طریقۂ تالیف یہ تھا کہ وہ اپنے حافظہ، تجربات ومشاہدات اور استنباطات کی روشنی میں کتابیں لکھتے تھے، بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ وہ دوران تالیف دوسری کتابوں کی طرف رجوع کرتے ہوں یا ان کے اقتباسات نقل کرتے ہوں"۔ (۱۳)

ابن نفیس نے طبی موضوعات پر بھی لکھا ہے اور دیگر علوم وفنون میں بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ ان کی تصانیف کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے:

(الف) طبی تصانیف: ۱- شرح القانون: ابن نفیس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ابن سینا کی شہرۂ آفاق تصنیف القانون فی الطب کی، جو پانچ جلدوں پر مشتمل ہے، مکمل شرح کی ہے۔ یوں تو القانون پر بہت کام ہوا ہے اور ہر دور میں اس کی شرح، تلخیص، تحشیہ اور ترجمہ کی خدمت انجام دی گئی ہے۔ اس شرح کے قلمی نسخے دنیا کی مختلف لائبریریوں میں پائے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں رضا لائبریری رام پور میں مکمل شرح موجود ہے۔ (۱۴)

۲- موجز القانون: قانون ابن سینا کی شرح کرنے کے علاوہ ابن نفیس نے اس کا خلاصہ

بھی تیار کیا تھا جو موجز القانون یا الموجز فی الطب کے نام سے مشہور ہوا۔اس کے بہت سے مخطوطات دنیا کی مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہیں اور بارہا یہ شائع ہوتی رہی ہے۔ ہندوستان میں سب سے پہلے ۱۸۲۸ء میں اس کی اشاعت ہوئی تھی۔(۱۵)

۳-شرح تشریح القانون: اس کتاب میں اس نے دوران خون سے متعلق جالینوس اور ابن سینا کے نظریات کا رد کرتے ہوئے دوران خون رئوی سے متعلق اپنی تحقیق پیش کی ہے۔اس کتاب کے قلمی نسخے دنیا کی مختلف لائبریریوں میں پائے جاتے ہیں۔

۴-کتاب الشامل فی الطب: زرکلی نے لکھا ہے کہ اس کی ایک ضخیم جلد مکتبہ ظاہریہ دمشق میں موجود ہے۔(۱۶) دارالکتب قاہرہ اور بودلیانہ لائبریری میں اس کے چند اجزاء پائے جاتے ہیں۔

۵-شرح مبادی البقراط: اس کے قلمی نسخے دنیا کی بہت سی لائبریریوں میں موجود ہیں۔ ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء میں ایران سے شائع بھی ہوچکی ہے۔

۶-شرح فصول البقراط: اس کے بہت سے قلمی نسخے پائے جاتے ہیں۔ایک نسخہ دارالکتب قاہرہ میں اور ایک ایا صوفیا لائبریری استنبول میں موجود ہے۔۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء میں ایران سے طبع ہوئی ہے۔

۷-رسالۃ فی منافع الاعضاء: اس کا قلمی نسخہ دارالکتب قاہرہ میں موجود ہے۔

۸-المہذب فی الکحل: اس کا ایک نسخہ مکتبہ ظاہریہ دمشق میں اور دوسرا ویٹیکن لائبریری میں موجود ہے۔

۹-شرح تقدمۃ المعرفۃ للبقراط: اس کا قلمی نسخہ دارالکتب قاہرہ میں موجود ہے۔

۱۰-شرح اوبئۃ البقراط: اس کا قلمی نسخہ ایا صوفیا لائبریری استنبول میں موجود ہے۔

۱۱-شرح کتاب المسائل لحنین بن اسحاق: اس کا قلمی نسخہ لیدن لائبریری میں موجود ہے۔

۱۲-بغیۃ الفطن من علم البدن: اس کا قلمی نسخہ ویٹیکن لائبریری میں موجود ہے۔

سوانح نگاروں نے ان کے علاوہ اور بھی تصنیفات کے نام تحریر کیے ہیں، لیکن ان کے کسی لائبریری میں محفوظ ہونے کی خبر نہیں ہے۔

(ب) دیگر علوم کی تصانیف: دیگر علوم وفنون میں ابن نفیس کی متعدد تصانیف کا تذکرہ

سوانح نگاروں نے کیا ہے، مگران میں سے بیش تر کے کہیں موجود ہونے کی کچھ خبر نہیں ہے۔مثلاً انہوں نے فقہ میں شافعی فقیہ فیروزآبادی شیرازی (م ۴۷۶ھ/۱۰۸۳ء) کی کتاب التنبیہ ، فلسفہ میں ابن سینا کی کتاب الاشارات اور منطق میں ان ہی کی کتاب الھدایة کی شرح کی تھی۔اسی طرح لغت وبیان میں ان کی ایک ایک کتاب طریق الفصاحة کا تذکرہ ملتا ہے۔ مگران کتابوں کا کچھ اتاپتانہیں۔ان کی دستیاب کتابوں میں سے ایک مختصر فی علم اصول الحدیث ہے۔جودارالکتب قاہرہ میں محفوظ ہے اوردوسری الرسالة الکاملية فی السیرة النبوية ہے، جوطبع ہوچکی ہے۔آیندہ سطور میں اسی کتاب کا مطالعہ وتجزیہ پیش کیا جارہا ہے:

الرسالة الکاملية فی السیرة النبوية : اس کتاب کے صرف دوقلمی نسخوں کا علم ہوسکا ہے۔ایک دارالکتب قاہرہ میں ہے اوردوسرا مکتبہ مصطفیٰ آفندی استنبول میں۔یہ کتاب چارفنون پر مشتمل ہے۔اس اعتبار سے استنبول کانسخہ مکمل ہے، جب کہ قاہرہ کانسخہ ناقص ہے۔اس میں صرف ابتدائی تین فنون پائے جاتے ہیں۔

مستشرق یوسف شاخت (JOSYPH SCHACHT) (م ۱۳۹۰ھ/۱۹۷۰ء) اور ماکس ماریہوف (MAX MAEYER HOF) (م ۱۳۶۴ھ/۱۹۴۵ء) نے استنبول کے نسخے کوایڈٹ کیا اوراس کے ملخص انگریزی ترجمہ کے ساتھ اسے آکسفورڈ سے شائع کیا۔(۱۷) مشرق میں اس کی اشاعت دونوں قلمی نسخوں کی روشنی میں اسے ایڈٹ کرکے، جامع ازہرمصر میں السیرة والسنة النبوية کے موضوع پر چوتھی عالمی کانفرنس (صفر ۱۴۰۶ھ/نومبر ۱۹۸۵ء) کے انعقاد کی مناسبت سے اس وقت کے شیخ الازہر الشیخ جادالحق علی جادالحق کی دلچسپی سے عمل میں آئی۔اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۴۰۸ھ/۱۹۸۷ء میں مزید تنقیح واضافہ کے ساتھ لجنة احیاء التراث الاسلامی ، المجلس الاعلی للشئون الاسلامية ،وزارة الاوقاف مصر کی جانب سے منظرعام پرآیا ہے۔ تحقیق وتعلیق کی خدمت عبدالمنعم محمد عمر نے انجام دی ہے اور مراجعہ کا کام ڈاکٹر احمد عبدالمجید ہریدی نے کیا ہے۔فاضل محقق نے شروع میں دوبحثوں کا اضافہ کیا ہے، جن میں صاحب کتاب کے حالات وسوانح پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور کتاب کا مبسوط تجزیہ کیا ہے۔یہی ایڈیشن راقم السطور کے پیش نظر ہے۔

بعض مصادر میں ابن نفیس کی تصنیفات کی فہرست میں ایک کتاب کا نام فاضل بن ناطق ملتا ہے۔ حقیقت میں وہ یہی رسالہ کاملیہ ہے۔ اس کا راوی فاضل بن ناطق کامل نامی ایک شخص کا قصہ بیان کرتا ہے کہ وہ کیسے پیدا ہوا؟ کس طرح پلا بڑھا؟ کیسے اس نے حواس کے ذریعے مختلف قوائے جسمانیہ کی معلومات حاصل کیں؟ پھر کس طرح اللہ سبحانہ کی ذات وصفات، نبوت کی ضرورت، خاتم النبیین ﷺ کے حالات زندگی اور تعلیمات، پھر اخروی زندگی سے متعلق معلومات حاصل کیں اور استنباطات کیے؟ راوئ قصہ کا نام فاضل بن ناطق رکھ کر ابن نفیس یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ راوی بڑے علم وفضل والا ہے اور اس نے منطقی سوچ اپنے باپ سے وراثت میں پائی ہے۔ قصہ کے مرکزی کردار (ہیرو) کا نام کامل تجویز کر کے وہ اس جانب اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ایسا انسان ہے جسے اللہ نے اوصاف حمیدہ اور عقل تام سے نوازا ہے۔ اس رسالہ میں اس کے علاوہ اور کوئی "رمز" نہیں ہے اور نہ اس میں فلسفیانہ اور صوفیانہ اصطلاحات ہیں۔ کتاب کے مرکزی کردار کا نام کامل ہے اور اس کے چار فنون میں سے دو سیرت نبوی ﷺ سے متعلق ہیں۔ اسی لیے اس کا نام الرسالة الكاملية فی السيرة النبوية رکھا گیا ہے۔

مقصد تالیف: یہ رسالہ بنیادی طور پر سیرت نبوی سے متعلق ہے، لیکن اس میں علم الکلام کے بعض اہم موضوعات بھی زیر بحث آئے ہیں۔ ابن نفیس نے بہت آسان اور عام فہم انداز میں اہل اسلام کی آراء پیش کی ہیں اور منحرف فلسفیانہ افکار کا رد کیا ہے۔ اس رسالہ کے ذریعے ان کا مقصد مذہب اور فلسفہ کے درمیان ہم آہنگی دکھانا تھا۔ انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عقل انسانی خالص منطقی انداز میں غور وخوض کر کے اور بغیر کسی واسطے کے، اللہ تعالیٰ کے وجود، انبیائے کرام کی بعثت اور خاتم النبیین کی ضرورت کا استنتاج کر سکتی ہے۔ اسی طرح وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ آخری نبی کی سیرت (ولادت، ہجرت، جہاد، وفات وغیرہ) اور تعلیمات (عبادات، شریعت، معاملات وغیرہ) کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر سکے۔

اس رسالہ کا تعارف کراتے ہوئے صلاح الدین الصفدی (م ۷۶۴ھ/۱۳۶۳ء) نے لکھا ہے:

> "ابن نفیس نے اس میں نبوتوں، شرائع، بعثت جسمانی اور فنائے دنیا کے موضوعات پر اہل اسلام کے مسلک اور ان کی آراء کی حمایت کی ہے۔ میری جان

کی قسم انہوں نے اس میں بڑی جدت طرازیاں کی ہیں۔ اس رسالہ سے ان کی قادرالکلامی، صحت ذہن اور علوم عقلیہ پر دست رس کا اظہار ہوتا ہے"۔(۱۸)

دیگر اہم موضوع رسائل سے موازنہ: موضوع، مشتملات اور اسلوب کے لحاظ سے ابن نفیس کے اس رسالہ کے مثل ابن سینا اور ابن طفیل (م ۵۸۱ھ/۱۱۸۵ء) کے دو رسالے ہیں، مگر نام ایک یعنی رسالۃ حی بن یقظان ہے۔ ابن نفیس نے ان میں سے کس رسالہ کا معارضہ کیا ہے؟ محققین اس معاملے میں مختلف الرائے ہیں:

صفدی نے لکھا ہے کہ ابن نفیس نے ابن سینا کے رسالۃ حی بن یقظان کا معارضہ کیا ہے۔ ابن سینا کا رسالہ بہت مختصر اور مغلق و غامض عبارات میں تھا۔ چنانچہ ان کے شاگردوں ابو منصور الحسین بن زبلہ اور ابوعبید جوز جانی نے اس کی شرحیں کیں اور خود ابن سینا نے اس کی شرح لکھی تھی۔(۱۹)

مستشرق یوسف شاخت اور ماکس مایرہوف اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ابن نفیس کا یہ رسالہ ابن سینا کے رسالے کے بجائے ابن طفیل کے رسالہ سے مشابہت رکھتا ہے۔ اسی لیے ان حضرات نے ان دونوں رسالوں کا موازنہ کیا ہے۔ انہوں نے ابن سینا اور ابن طفیل کے رسالوں کے درمیان کسی تعلق کا اظہار نہیں کیا ہے۔(۲۰)

الف-موازنہ رسالۃ کاملیۃ ورسالۃ حی بن یقظان (ابن سینا): ابن نفیس اور ابن سینا کے رسالوں کے موازنہ کا خلاصہ درج ذیل نکات کی صورت میں بیان کیا جاسکتا ہے:

۱- دونوں میں قصصی اسلوب پایا جاتا ہے۔ ابن سینا کے رسالے میں راوئ قصہ اپنے دوستوں کے ساتھ ایک تفریح گاہ میں پہنچتا ہے، جہاں اس کی ملاقات ایک بزرگ سے ہوتی ہے۔ وہ لوگ اس سے مختلف سوالات کرتے ہیں جن کے وہ جواب دیتا ہے۔ یہ جوابات ابن سینا کی فلسفیانہ آراء پر مبنی ہیں۔

۲- ابن سینا کا پورا رسالہ رمزیہ ہے۔ اس نے بزرگ سے عقل انسانی اور راوئ قصہ اور اس کے رفقاء کے ساتھ اس بزرگ کے بحث و مباحثہ سے انسان کی عقل اور اس کی شہوات کے درمیان ہونے والی کشاکش مراد لی ہے۔ اسی طرح کے دیگر رموز ہیں۔ جب کہ ابن نفیس

کے رسالے میں کوئی رمز نہیں ہے۔

۳- ابن سینا کا رسالہ اس کی فلسفیانہ اور صوفیانہ آراء پر مبنی ہے، جن میں سے بہت سی آراء صحیح دینی عقائد سے ٹکراتی ہیں، مثلاً ابن سینا کے نزدیک عقل انسانی اپنی کاوش سے اللہ سبحانہ کی معرفت اور تعلیمات انبیاء تک رسائی حاصل کرسکتی ہے۔ گویا انبیاء نے جو تعلیمات پیش کیں وہ ان کی عقلی کاوش کا نتیجہ تھیں۔ اسی طرح اس کے نزدیک انسان روحانی ریاضت اور مجاہدۂ نفس کرکے ماوراء الطبیعۃ کی معلومات حاصل کرسکتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نبوت وہبی نہیں بلکہ اکتسابی ملکہ ہے۔ اسی طرح اس نے بعث جسمانی کا انکار کیا ہے۔ ابن نفیس نے اپنے رسالے میں ان افکار کا معارضہ کیا ہے اور اپنی آراء کو اسلام کے بنیادی عقائد کے تابع رکھا ہے۔ (۲۱)

(ب) موازنہ رسالۂ کاملیہ و رسالۃ حی بن یقظان (ابن طفیل): ابن نفیس اور ابن طفیل کے رسالوں میں اشتراک و اختلاف کے متعدد پہلو ہیں:

۱- دونوں میں ایک انسان ایک دور دراز ویران جزیرہ میں عناصر کی مخصوص ترتیب و ترکیب سے پیدا ہوتا ہے اور اپنے ذہن سے کائنات کے طبیعیاتی، فلسفیانہ اور مذہبی حقائق کی معرفت حاصل کرتا ہے۔

۲- ابن طفیل کے ہیرو کی دیکھ بھال بچپن میں ایک ہرنی کرتی ہے۔ جب کہ ابن نفیس کا ہیرو تنہا پرورش پاتا ہے۔

۳- ابن طفیل کا ہیرو آگ استعمال کرنا، کھانا پکانا اور کپڑے پہننا خود سے سیکھتا ہے، جبکہ ابن نفیس کا ہیرو ان چیزوں کو ان لوگوں سے سیکھتا ہے جو اچانک اس جزیرے پر آگئے تھے۔

۴- ویران جزیرہ پر دوسرے انسانوں کی آمد کو دونوں مولفین نے استعمال کیا ہے، لیکن مختلف اغراض سے۔ ابن طفیل انہیں ان باتوں کی سچائی پر گواہ بناتے ہیں جن کی دریافت ان کے ہیرو نے اپنے ذاتی غور و خوض سے کی تھی اور ابن نفیس انہیں ذریعہ بناتے ہیں اپنے ہیرو کے، باہر کی دنیا میں نکلنے کا، جہاں اس کے مشاہدہ کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اور ان چیزوں کی تصدیق ہوتی ہے جن کی معرفت اس نے اپنے ذاتی غور و خوض سے حاصل کی تھی۔

۵- ابن طفیل کا رسالہ صوفیانہ غور و خوض کو ظاہر کرتا ہے، جب کہ ابن نفیس کا میلان

وجود چند مقاصد کے لیے ہے اور ان کے بعض منافع ہیں۔ ان میں سے کسی کی منفعت نہ معطل ہے نہ اس کا وجود بے کار ہے۔ پھر اس نے ان موجودات کے بارے میں غور کیا کہ وہ اپنے آپ وجود میں آگئی ہیں یا کسی نے انہیں وجود بخشا ہے؟ اگر انہیں کسی نے وجود بخشا ہے تو وہ کون ہے اور اس کا کیا حال ہے؟ اس طرح اس نے ذاتی غور و خوض کے ذریعے جان لیا کہ ان چیزوں کو وجود بخشنے والی ذات واجب الوجود ہے۔ (ص ۱۵۴-۱۵۹)

تیسری فصل کی ابتداء میں ابن نفیس نے تمدن سے بحث کی ہے۔ لکھا ہے کہ ''اتفاقاً ایسا ہوا کہ ہواؤں کے تھپیڑوں سے اس جزیرہ کے ساحل پر ایک کشتی آگئی، جس میں بہت سے تاجر پیشہ افراد اور دوسرے لوگ تھے۔ کشتی میں جو ٹوٹ پھوٹ ہوگئی تھی اس کی اصلاح کے لیے وہ لوگ اس جزیرہ میں کچھ دن رہے۔ وہ پورے جزیرہ میں گھوم پھر کر آگ جلانے کے لیے لکڑیاں اور کھانے کے لیے پھل چننے لگے۔ کامل نے انہیں دیکھا تو ان سے ڈرا۔ ان لوگوں نے اس کے سامنے روٹی اور کھانا ڈالا، جسے کامل نے کھایا تو اسے بہت اچھا لگا۔ اس لیے کہ اس سے قبل اس نے کبھی پکا ہوا کھانا نہیں کھایا تھا۔ پھر وہ ان سے اور مانوس ہوا تو انہوں نے اسے کپڑا پہنایا اور بول چال سکھائی۔ اس طرح اس نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ ان لوگوں نے اسے اپنے شہروں کے حالات بتائے تو اسے بہت تعجب ہوا۔ اس لیے کہ وہ سمجھتا تھا کہ پوری دنیا بس یہی جزیرہ ہے۔ اس نے ان کے ساتھ سفر کرنے کی خواہش کی تو وہ اسے اس جزیرہ کے قریبی شہر میں لے گئے، جہاں اس نے وہاں کے لوگوں کے کھانے کھائے اور ان کے لباس پہنے تو اسے خوب لذت محسوس ہوئی اور ساتھ ہی زندگی کی کلفتیں یاد آئیں۔ تب اسے معلوم ہوا کہ انسان چونکہ مصنوعی غذا اور مصنوعی لباس کا ضرورت مند ہے۔ اس لیے تنہا رہنے کی صورت میں اس کی زندگی میں خوش گواری نہیں آتی بلکہ ضروری ہے کہ وہ تمدن پسند ہو، جماعت کے ساتھ رہے، ان میں سے کوئی کھیت جوتے، کوئی بوئے، کوئی روٹی پکائے، کوئی کپڑا سیے۔ (ص ۱۶۰-۱۶۱)

پھر ضرورت نبوت کی دلیل پیش کرتے ہوئے لکھا: ''پھر کامل نے سوچا کہ انسان کی معیشت میں بہتری کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے ذریعے بیع و اجارہ کے معاملات انجام پائیں۔ ان معاملات میں بسا اوقات تنازعات پیش آسکتے ہیں۔ ہر آدمی یہ سوچ سکتا ہے کہ وہ حق پر

وجود چند مقاصد کے لیے ہے اور ان کے بعض منافع ہیں۔ ان میں سے کسی کی منفعت نہ معطل ہے نہ اس کا وجود بے کار ہے۔ پھر اس نے ان موجودات کے بارے میں غور کیا کہ وہ اپنے آپ وجود میں آ گئی ہیں یا کسی نے انہیں وجود بخشا ہے؟ اگر انہیں کسی نے وجود بخشا ہے تو وہ کون ہے اور اس کا کیا حال ہے؟ اس طرح اس نے ذاتی غور و خوض کے ذریعے جان لیا کہ ان چیزوں کو وجود بخشنے والی ذات واجب الوجود ہے۔ (ص ۱۵۴-۱۵۹)

تیسری فصل کی ابتداء میں ابن نفیس نے تمدن سے بحث کی ہے۔ لکھا ہے کہ ''اتفاقاً ایسا ہوا کہ ہواؤں کے تھپیڑوں سے اس جزیرہ کے ساحل پر ایک کشتی آ لگی، جس میں بہت سے تاجر پیشہ افراد اور دوسرے لوگ تھے۔ کشتی میں جو ٹوٹ پھوٹ ہو گئی تھی اس کی اصلاح کے لیے وہ لوگ اس جزیرہ میں کچھ دن رہے۔ وہ پورے جزیرہ میں گھوم پھر کر آگ جلانے کے لیے لکڑیاں اور کھانے کے لیے پھل چننے لگے۔ کامل نے انہیں دیکھا تو ان سے ڈرا۔ ان لوگوں نے اس کے سامنے روٹی اور کھانا ڈالا، جسے کامل نے کھایا تو اسے بہت اچھا لگا۔ اس لیے کہ اس سے قبل اس نے کبھی پکا ہوا کھانا نہیں کھایا تھا۔ پھر وہ ان سے اور مانوس ہوا تو انہوں نے اسے کپڑا پہنایا اور بول چال سکھائی۔ اس طرح اس نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ ان لوگوں نے اسے اپنے شہروں کے حالات بتائے تو اسے بہت تعجب ہوا۔ اس لیے کہ وہ سمجھتا تھا کہ پوری دنیا بس یہی جزیرہ ہے۔ اس نے ان کے ساتھ سفر کرنے کی خواہش کی تو وہ اسے اس جزیرہ کے قریبی شہر میں لے گئے، جہاں اس نے وہاں کے لوگوں کے کھانے کھائے اور ان کے لباس پہنے تو اسے خوب لذت محسوس ہوئی اور ساتھ ہی زندگی کی کلفتیں یاد آئیں۔ تب اسے معلوم ہوا کہ انسان چونکہ مصنوعی غذا اور مصنوعی لباس کا ضرورت مند ہے۔ اس لیے تنہا رہنے کی صورت میں اس کی زندگی میں خوش گواری نہیں آتی بلکہ ضروری ہے کہ وہ تمدن پسند ہو، جماعت کے ساتھ رہے، ان میں سے کوئی کھیت جوتے، کوئی بوئے، کوئی روٹی پکائے، کوئی کپڑا سیے۔ (ص ۱۶۰-۱۶۱)

پھر ضرورت نبوت کی دلیل پیش کرتے ہوئے لکھا: ''پھر کامل نے سوچا کہ انسان کی معیشت میں بہتری کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے ذریعے بیع و اجارہ کے معاملات انجام پائیں۔ ان معاملات میں بسا اوقات تنازعات پیش آ سکتے ہیں۔ ہر آدمی یہ سوچ سکتا ہے کہ وہ حق پر

اور دوسرا سر غلط ہے۔اس بنا پر انسانوں کی معیشت میں بہتری اسی صورت میں آسکتی ہے جب ان کے درمیان ایک محفوظ شریعت ہو، جو ان کے باہمی تنازعات ختم کرنے والی ہو اور جس کی تمام لوگ اطاعت کرتے ہوں اور ان کے درمیان اسے قبول عام حاصل ہو۔اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب اس کے بارے میں ان کا یہ عقیدہ ہو کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے اور اس کا امکان اسی صورت میں ہے جب اسے کوئی ایسا شخص پیش کرے جس کی لوگ تصدیق کریں کہ واقعی وہ اسے اللہ کی طرف سے پیش کر رہا ہے۔ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ اس شخص سے معجزہ کا ظہور ہو تاکہ لوگوں کو احساس ہو کہ وہ جو کچھ پیش کر رہا ہے وہ جھوٹ اور من گھڑت نہیں ہے، بلکہ برحق اور من جانب اللہ ہے۔ایسا شخص نبی ہوگا اور محال ہے کہ ایسے شخص کا فائدہ عام ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ اسے پیدا نہ کرے۔(ص ۱۶۱-۱۶۲)

آخر میں نبوت کے تسلسل، پھر ختم نبوت کا تذکرہ ہے:

''اسی طرح ضروری ہے کہ پے در پے انبیاء آئیں، تاکہ ہر نسل کے لوگوں کی مذہبی ضروریات کی تکمیل ہو، یہاں تک کہ خاتم النبیین کی بعثت ہو اور وہ ان میں سب سے افضل ہوں، اس لیے کہ ان کے بعد نبوت کا سلسلہ منقطع ہے، اس لیے ضروری ہے کہ وہ ایسی تمام چیزیں پیش کریں، جن کی نبوت کے فائدہ کی تکمیل کے لیے ضرورت ہے''۔(ص ۱۶۴-۱۶۵)

فن دوم: اس فن کو ابن نفیس نے خاتم النبیین ﷺ کی سیرت کے لیے خاص کیا ہے اور اس میں دس فصلوں کے تحت آپ ﷺ کے نسب، وطن، پرورش، ہیئت، عمر اور اولاد وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔انہوں نے اس میں ذکر کیا ہے کہ کس طرح کامل نے محض عقلی غور و خوض کے ذریعے خاتم النبیین ﷺ کے اوصاف معلوم کیے۔ابن نفیس نے کامل کی زبانی کس طرح خاتم النبیین ﷺ کے احوال بیان کیے ہیں۔اس سلسلے میں چند مثالیں درج ذیل ہیں، نسب کے بارے میں لکھا ہے:

''ضروری ہے کہ یہ نبی بہت زیادہ شریف النسب ہو، تاکہ لوگ اس کی بات سنیں اور سب سے زیادہ شرافت نسبی مذہبی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے اور ان میں بھی سب سے افضل وہ نبی ہے جس کی تعظیم پر تمام ملتیں متفق ہوں اور یہ نبی حضرت ابراہیمؑ ہیں۔اس لیے ضروری ہے کہ خاتم النبیین ﷺ کی نسبت ان کی طرف ہو۔اسی طرح

ضروری ہے کہ یہ نبی اپنی ملت کے علاوہ کسی اور ملت کی طرف منسوب نہ ہو، یعنی نہ یہودی ہو نہ نصرانی، ورنہ اسے لوگ مبتدع اور کافر سمجھیں گے اور اس سے نفرت کریں گے اس لیے جائز نہیں کہ اس کی نسبت حضرت یعقوبؑ یا حضرت عیسیٰؑ کی طرف ہو، بلکہ ضروری ہے کہ وہ حضرت اسماعیلؑ کی نسل سے ہو اور ان کی نسل میں سب سے اشرف بنو ہاشم تھے۔اس لیے ضروری ہے کہ وہ ان میں سے ہو"۔(ص ۱۶۹-۱۷۱)

خاتم النبیین ﷺ کے وطن کے بارے میں لکھا ہے:

"دیہاتوں اور صحراء میں رہنے والوں کی عقلیں اوران کی آراء شہروں میں رہنے والوں کے مقابلے میں ناقص ہوتی ہیں۔اس لیے ضروری ہے کہ یہ نبی شہر والوں میں سے ہو اور شہر مختلف اعتبارات سے ایک دوسرے سے برتر ہوتے ہیں، مثلاً ہوا کا اعتدال، نرخون کی بہتری، پھلوں کی کثرت، پانی کی زیادتی وغیرہ۔البتہ لوگوں کے دلوں میں کسی شہر کی مذہبی عظمت ان چیزوں کی وجہ سے ہوتی ہے، جن سے وہ شہر قابل ترجیح قرار پاتا ہے خاص طور پر اگر وہاں کوئی بڑا اعبادت خانہ ہو اور سب سے افضل اور سب سے قدیم عبادت خانہ البیت العتیق ہے۔اس لیے کہ وہ "پہلا گھر ہے جسے لوگوں کے لیے بنایا گیا تھا" اس لیے ضروری ہے کہ خاتم النبیین ﷺ کی جائے پیدائش مکہ ہو"۔ (ص ۱۷۲ - ۱۷۳)

آپ ﷺ کی ابتدائی زندگی کے بارے میں لکھا ہے:

"ضروری ہے کہ نبی ﷺ کے باپ کا انتقال پہلے ہو، پھر آپ ﷺ کی ماں وفات پائیں اور آپ ﷺ کو آپ ﷺ کی ماں کے علاوہ کوئی دوسری عورت دودھ پلائے، اس کے بعد آپ ﷺ کے دادا اور متعدد چچا آپ ﷺ کی پرورش کریں۔یہ سب اس لیے تاکہ مختلف مربّین کی تاثیر سے آپ ﷺ کا مزاج معتدل ہو جائے"۔(ص ۱۷۷-۱۷۹)

ہجرت اور مقام ہجرت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"یہ بات قرین عقل نہیں تھی کہ نبی ﷺ کا مکہ سے نکلنا اختیاری ہو، بلکہ ضروی تھا کہ وہ اضطراری حالت میں ہو، اور یہ بات بھی قرین عقل نہیں تھی کہ ایسا آپ ﷺ کی جلا وطنی یا جنگ میں شکست کے نتیجے میں ہو، اس لیے کہ ایسا عظیم انسانوں کے شایان شان

نہیں ہوتا، اس لیے آپ ﷺ کی ہجرت کی صورت یہ ہوئی کہ کفار نے آپ ﷺ کو خفیہ طور پر قتل کرنے کی سازش کی۔ پھر آپ ﷺ کی ہجرت کس شہر کی طرف ہو؟ یقیناً اس شہر کی طرف جس میں آپ ﷺ کے والد کا انتقال ہوا تھا، تاکہ جب آپ ﷺ کا انتقال ہو تو آپ ﷺ کی قبر آپ کے والد کی قبر سے قریب ہو، یعنی آپ ﷺ کی ہجرت یثرب کی طرف ہو"۔ (ص ۱۷۴-۱۷۶)

نبی ﷺ کی عمر کے بارے میں لکھا ہے:

"رہی اس نبی کی عمر تو ضروری ہے کہ آپ ﷺ عمر کہولت کو پورا کریں، تاکہ اس زمانے میں آپ ﷺ کو نبوت حاصل ہو۔ اور ضروری ہے کہ شیخوخت (جس میں سٹھیاپن اور کم عقلی کی علامت ظاہر ہو جاتی ہیں) کے استحکام سے قبل آپ کی وفات ہو جائے۔ اور ایسا معتدل المزاج ابدان میں باسٹھ تریسٹھ سال کے بعد ہوتا ہے"۔ (ص ۱۸۴)

خاتم النبیین ﷺ کی جائے وفات کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اگر نبی ﷺ کی وفات مکہ میں ہوتی اور وہیں آپ کو دفن کر دیا جاتا تو آپ ﷺ کی زیارت خانہ کعبہ کی زیارت کے ماتحت ہوتی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگ گمان کرنے لگتے کہ حج صرف خانہ کعبہ کے لیے ہے اور وہ نبی اور آپ ﷺ کی شریعت کو بھول جاتے، اس لیے مناسب تھا کہ آپ ﷺ کی قبر کسی دوسرے شہر میں ہو، تاکہ اس کا سفر بالقصد کیا جائے، اس طرح آپ ﷺ کی عظمت قائم و دائم رہے"۔ (ص ۱۷۳-۱۷۴)

آپ ﷺ کی آل و اولاد کے بارے میں لکھتے ہیں:

"چونکہ اس نبی کا مزاج معتدل ہے، اس لیے ضروری ہے کہ آپ کے بیٹے اور بیٹیاں دونوں ہوں۔ اور ضروری ہے کہ بیٹوں کی عمریں زیادہ نہ ہوں۔ اس لیے کہ اگر ان کی عمریں زیادہ ہوتیں اور وہ نبوت کی عمر کو پہنچ جاتے، تب یا تو وہ نبی ہوتے یا نہ ہوتے، نبی ہونا ان کے لیے ممکن نہ تھا، اس لیے کہ ان کے باپ خاتم النبیین تھے اور نبی نہ ہوتے تو یہ چیز ان کے باپ کے مقام و مرتبہ کو کم کرنے والی ہوتی، اس لیے کہ بہت

سے انبیاء ایسے گزرے ہیں جن کی اولادیں بھی نبی تھیں، رہیں اس نبی کی بیٹیاں تو ان کی عمریں لمبی ہوسکتی ہیں، اس لیے کہ عورتیں نبوت کی اہل نہیں ہیں"۔ (ص ۱۸۵-۱۸۶)

فن سوم: اس میں ابن نفیس نے کامل کی زبان سے خاتم النبیین ﷺ کی تعلیمات پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ دو ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے میں نبی ﷺ کی نظری تعلیمات کے بیان میں دو فصلوں کے تحت صفات الٰہی اور معاد کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ اللہ کی ذات وصفات کا ذکر ان الفاظ میں ہے:

"نبی ﷺ کے شایان شان یہ ہے کہ وہ لوگوں کو بتائے کہ ان کا ایک پیدا کرنے والا ہے، جسے بے حد و نہایت عظمت و جلالت حاصل ہے۔ ضروری ہے کہ اس کی عبادت و اطاعت کی جائے اور یہ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس کے مثل کوئی نہیں۔ وہ سننے اور جاننے والا ہے۔ اس کے علاوہ وہ قدرت تامہ اور قوت کاملہ کی صفات کا مالک ہے، جو اس کی ذات کے شایان شان ہیں"۔ (ص ۱۹۳)

معاد کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ابن نفیس نے اسے روحانی اور بدنی کا مجموعہ قرار دیا ہے، لکھا ہے:

"کامل نے سوچا کہ نبی کے لیے جائز نہیں کہ وہ معاد کو صرف روحانی قرار دے، اس لیے کہ اکثر لوگوں کے ذہن روحانی لذتوں اور تکلیفوں کا ادراک نہیں کر پاتے۔ اور نہ اس کے لیے جائز ہے کہ اسے صرف بدنی قرار دے، اس لیے کہ اس کے ساتھ سعادت و شقاوت کا تصور ممکن نہیں، بلکہ ضروری ہے کہ وہ بدن اور نفس کا مرکب ہو"۔ (ص ۱۹۵-۱۹۶)

"کامل نے اپنے جی میں کہا، اس میں شک نہیں کہ انسان بدن اور نفس سے مرکب ہے۔ رہا بدن تو وہ محسوس چیز ہے اور نفس وہ ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انسان کہتا ہے "میں" یہ مشار الیہ بدن یا اس کے اجزاء نہیں ہوسکتے۔ اس لیے کہ ہر شخص یقینی طور پر جانتا ہے کہ اس کا بدن ابتدائے عمر سے انتہائے عمر تک یکساں حالت میں نہیں رہتا۔ بچپن میں اس کا بدن جیسا ہوتا ہے، بڑھاپے میں اس سے مختلف ہوتا ہے، اس لیے کہ اس کے اجزائے بدن میں ہمہ وقت تحلّل اور تغذیہ ہوتا

رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ ایک دوسرے کا بدل فراہم کرتے رہتے ہیں، جب کہ انسان جس چیز کو ''میں'' کہتا ہے، اس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اس لیے ضروری ہے کہ نفس اور بدن الگ الگ چیزیں ہوں۔ بدن محسوس جسم ہے، جب کہ نفس ایسا نہیں ہے۔ وہ مجرد جوہر ہے، اس کا عرض ہونا محال ہے......''۔ (ص ۱۹۶-۱۹۷)

باب دوم میں ابن نفیس نے چار فصلوں کے تحت عبادات، معاملات، تدبیر منزل اور سزاؤں سے تعلق نبی ﷺ کی تعلیمات اور ان کی حکمتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ مثال کے طور پر تعدد ازدواج کے سلسلے میں لکھا ہے:

''ایک عورت کو کئی مردوں سے نکاح کرنے کی اجازت دے دی جائے تو اس سے نسب میں فساد پیدا ہو جائے گا، جب کہ اگر ایک مرد کو کئی عورتوں سے نکاح کی اجازت دے دی جائے تو ایسا نہیں ہوگا۔ اس لیے نبی کے شایان شان یہ ہے کہ وہ مردوں کو ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت دے اور عورتوں کو ایک سے زیادہ شوہر رکھنے کی اجازت نہ دے''۔ (ص ۲۰۹)

فن چہارم: یہ فن دس فصلوں پر مشتمل ہے۔ ابتدائی فصلوں میں ابن نفیس نے ان واقعات کا تذکرہ کیا ہے جو خاتم النبیین ﷺ کی وفات کے بعد پیش آئے۔ انہوں نے کامل کی زبانی کہلوایا ہے کہ:

''خاتم النبیین ﷺ کے بعد پہلے آپ ﷺ کے اصحاب کے درمیان خلافت کے مسئلہ میں اختلاف ہوگا، پھر آراء میں اختلاف رونما ہوگا اور متعدد مسالک وجود میں آجائیں گے اور نبی ﷺ کی ملت دین کے اصول و فروع میں مختلف گروہوں میں بٹ جائے گی۔ پھر یہ ملت مختلف معاصی کا شکار ہو جائے گی، مثلاً اس میں شراب عام ہو جائے گی جب کہ نبی ﷺ نے اسے حرام قرار دیا تھا اور عورتیں بے پردہ ہو جائیں گی اور اجنبی مردوں کے سامنے آنے لگیں گی، جب کہ نبی ﷺ نے بے پردگی سے منع کیا تھا۔ اس معصیت کے نتیجے میں کفار کے حملوں کی صورت میں اس ملت کو سزا دی جائے گی''۔ (ص ۲۱۵-۲۲۶)

اس فن کی آخری دو فصلوں میں ابن نفیس نے مستقبل کی پیش گوئی کی ہے۔ نویں فصل میں وہ عالم علوی کا تذکرہ کرتے ہیں اور سورج، چاند، کواکب وغیرہ کی حرکات اور ان میں ہونے والی تبدیلیوں کو

بیان کرتے ہوئے پیش گوئی کرتے ہیں کہ ایک وقت ایسا آجائے گا جب سورج اور کواکب مغرب سے طلوع ہوں گے، تمام ملکوں میں دن رات برابر ہوجائیں گے، ہوا کا مزاج انسان کے مزاج سے غیر ہم آہنگ ہوجائے گا، جس کی بناپر ان کے اخلاق بگڑ جائیں گے اور شرور وفتن کی کثرت ہوجائے گی۔ (ص ۲۳۶-۲۳۸) دسویں فصل میں وہ بیان کرتے ہیں کہ عالم علوی میں تغیرات کے نتیجے میں اس کا اثر عالم سفلی پر بھی پڑے گا۔ روئے زمین پر شرور وفتن کی کثرت ہوجائے گی، جنگوں میں مرد بہت زیادہ ہلاک ہوجائیں گے، عورتوں کی کثرت ہوجائے گی جس سے آوارگی بڑھ جائے گی، کھیتی اور پھل کم ہوجائیں گے، نرخ بڑھ جائے گا، پانی نیچے اتر جائے گا، زلزلوں اور طوفانوں کی کثرت ہوجائے گی، وغیرہ۔ اس طرح انہوں نے دنیا کے فنا ہونے اور قیامت کے برپا ہونے کے احوال بیان کیے ہیں۔ (ص ۲۳۹-۲۴۳)

آخر میں ابن نفیس نے بعث بعد الموت اور حشر ونشر کا تصور پیش کیا ہے۔ (ص ۲۴۳-۲۴۴)

مختصر تجزیہ: ۱- الرسالۃ الکاملیہ کی بنیادی اہمیت یہ ہے کہ یہ سیرت نبوی کے موضوع پر منفرد اسلوب میں لکھا گیا ہے۔ اس میں سیرت کے تقریباً تمام موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ پہلے نبی ﷺ کے نام ونسب، وطن، خاندان، ولادت، پرورش اور ابتدائی زندگی، وحی ونبوت، دعوت، ہجرت، غزوات، عادات واطوار، جسمانی ہیئت، اولاد وغیرہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ پھر آپ ﷺ کی سنت، تعلیمات اور عبادات، معاملات اور دیگر امور زندگی میں آپ کے لائے ہوئے احکام وشرائع پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سیرت کی کتابوں میں عموماً صرف رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ اور مغازی وغیرہ کا بیان ملتا ہے۔ آپ ﷺ کی تعلیمات کو کم ہی موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ الرسالۃ الکاملیہ ان معدودے چند کتابوں میں ہے جن میں دو مستقل ابواب قائم کیے گئے ہیں۔ ایک میں آپؐ کے احوال زندگی کا بیان ہے تو دوسرے باب کو آپؐ کی تعلیمات کی شرح وبیان کے لیے خاص کیا گیا ہے۔

۲- کتاب کا اسلوب بیان بھی انفرادی نوعیت کا ہے۔ سیرت کی شاید ہی کوئی کتاب ہو جس میں یہ اسلوب اختیار کیا گیا ہو۔ اس طرح ابن نفیس یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اگر ایک شخص اپنی فطرت سلیم سے غور کرے تو وہ ٹھیک وہی نتائج نکالے گا جو نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ میں ظاہر ہوئے۔

۳- اس کتاب میں وجود باری تعالیٰ، توحید، نبوت، وحی، فنائے دنیا، حشر ونشر اور اسلام کے دیگر بنیادی عقائد کا بھرپور دفاع کیا گیا ہے۔ ابن نفیس ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ انہوں نے اپنے مباحث

میں اگرچہ فلسفہ سے تعرض کیا ہے لیکن کسی جگہ اسلامی تعلیمات سے ادنیٰ انحراف بھی نہیں ہے۔

۴- اس رسالہ کو حی بن یقظان کے نام سے تصنیف کردہ ابن سینا اور ابن طفیل کے رسالوں کے طرز پر لکھا گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ابن نفیس نے ان رسالوں میں پیش کردہ بعض فلسفیانہ افکار کا کامیاب معارضہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر فلاسفہ صرف معاد روحانی کے قائل ہیں۔ ابن نفیس نے ایک مستقل فصل میں معاد سے بحث کی ہے اور اسے جسمانی اور روحانی دونوں کا مجموعہ قرار دیا ہے۔

۵- اس رسالہ میں ''تشکیل تمدن'' سے بحث کی گئی ہے۔ ابن نفیس نے یہ فکر پیش کی ہے کہ تمدن، انسانوں کے اجتماع سے وجود میں آتا ہے۔ وہ جب یکجا ہوتے ہیں تو ان کے درمیان کاموں کی تقسیم ہوتی ہے اور ایک دوسرے کے ذریعے ان کی روزمرہ کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ یہ تصور اگرچہ یونانی فکر میں بھی پایا جاتا ہے اور مسلم فلاسفہ میں ابوالنصر فارابی (م ۳۳۹ھ/۹۵۰ء) نے بھی اپنی کتاب المدینة الفاضلة میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ بعد میں ابن خلدون (م ۸۰۸ھ/۱۴۰۶ء) نے بھی اسے بڑی منقح صورت میں پیش کیا، جس کی بنا پر اسے علم الاجتماع (Sociology) کا بانی کہا جاتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ابن خلدون سے نصف صدی قبل ابن نفیس اس فکر کو اپنے اس رسالہ میں واضح الفاظ میں پیش کر چکے تھے۔ (ابن خلدون کی ولادت ۷۳۲ھ/۱۳۳۲ء میں ہوئی جب کہ ابن نفیس کی وفات ۶۸۷ھ/۱۲۸۸ء میں ہو چکی تھی)۔

۶- ابن نفیس ایک ماہر طبیب تھے۔ اس کتاب میں بھی جا بجا ان کی طبی مہارت کے شواہد ملتے ہیں۔ انہیں دورانِ خون روی کے محقق کی حیثیت سے عالمی شہرت حاصل ہے۔ یہ تحقیق انہوں نے اپنی کتاب شرح تشریح قانون کے علاوہ اس کتاب میں بھی پیش کی ہے (ص ۱۵۵)۔ حیوانی اور انسانی اعضاء کی تشریح (Anatomy) اور منافع (ص ۱۵۱، ۱۵۵) بیان کیے ہیں۔ نبی ﷺ کی جسمانی ہیئت، مرضی کیفیات، مقدار عمر اور اولاد کے تذکرہ میں ''اعتدال مزاج'' پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور آپ ﷺ کی شخصیت کو اس کا مصداق ٹھہرایا ہے۔ نظام ہضم کی تفصیل بیان کرتے ہوئے استحالۂ غذا کے بارے میں ابن نفیس نے جو کچھ لکھا ہے وہ آج میڈیکل سائنس میں حقیقت بن چکا ہے، اس عمل کو طبی اصطلاح میں Metabolism کہا جاتا ہے، جو تحلّل (Catabolism) اور اغتذاء (Anabolism) کا مجموعہ ہوتا ہے۔

حواشی ومراجع

(۱) ابن نفیس کے حالات زندگی کے لیے ملاحظہ کیجیے: شمس الدین الذہبی، تاریخ الاسلام۔ شمس الدین الذہبی، دول الاسلام، دائرۃ المعارف العثمانیہ، ۱۳۳۷ھ۔ ابن العماد الحنبلی، شذرات الذہب فی اخبار من ذہب، مکتبۃ القدسی القاہرۃ، ۱۳۵۱ھ۔ ابن اسعد الیافعی الیمنی، مرآۃ الجنان وعبرۃ الیقظان فی معرفۃ ما یعتبر من حوادث الزمان، دائرۃ المعارف العثمانیۃ، حیدرآباد۔ ۱۹۳۹ء۔ جلال الدین السیوطی، حسن المحاضرۃ فی اخبار مصر والقاہرۃ، المطبعۃ الشرفیۃ مصر، ۱۳۲۷ھ۔ ابن فضل اللہ العمری، مسالک الابصار فی ممالک الأمصار۔ ابن تغری بردی، النجوم الزاہرۃ فی ملوک مصر والقاہرۃ، دار الکتب المصریۃ، ۱۳۵۷ھ۔ صلاح الدین الصفدی، الوافی بالوفیات۔ طاش کبری زادہ، مفتاح السعادۃ۔ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، دار الریان للتراث القاہرۃ، ۱۹۸۸ء۔ خیر الدین الزرکلی، الاعلام، دار العلم للملایین، بیروت، ۱۹۹۷ء۔ دائرۃ المعارف الاسلامیۃ (اردو)، دانش گاہ پنجاب، لاہور، مقالہ ''ابن نفیس'' از ماکس مایرہوف۔ تاج الدین السبکی، طبقات الشافعیۃ الکبری، دار احیاء الکتب العربیۃ، مصر۔ (۲) ابن ابی اصیبعہ، عیون الانباء فی طبقات الاطباء، مخطوطہ، المکتبۃ الظاہریۃ دمشق، بحوالہ الرسالۃ الکاملیۃ فی السیرۃ النبویۃ، لجنۃ احیاء التراث الاسلامی، المجلس الاعلیٰ للشئون الاسلامیۃ مصر، تعلیق وتحقیق عبدالمنعم محمد عمر، ۱۴۰۸ھ/۱۹۸۷ء، طبع دوم، مقدمۂ محقق، ص ۲۴۔ عیون الانباء کے مطبوعہ نسخہ میں ابن نفیس کا تذکرہ نہیں ہے۔ اسی بنا پر بعض سوانح نگاروں مثلاً مایرہوف (Maeyerhof) نے لکھا ہے کہ معاصرانہ چشمک اور بعض اختلافات کی وجہ سے ابن ابی اصیبعہ نے جان بوجھ کر ابن نفیس کا تذکرہ نہیں لکھا تھا، لیکن ڈاکٹر یوسف الغش نے المکتبۃ الظاہریۃ میں اس کا ایک قلمی نسخہ دریافت کیا ہے، جس میں ان کا تذکرہ شامل ہے۔ اس سے مذکورہ خیال کی تردید ہوجاتی ہے۔ (۳) بحوالہ تاریخ الاسلام للذہبی۔ (۴) حوالہ سابق۔ (۵) مرآۃ الجنان، ۴/۲۰۷، حسن المحاضرۃ، ۱/۲۳۳، شذرات الذہب، ۵/۴۰۱۔ (۶) طبقات الشافعیۃ الکبریٰ، ۸/۳۰۵۔ (۷) بحوالہ شذرات الذہب، ۵/۴۰۲۔ (۸) النجوم الزاہرۃ، ۷/۳۷۷۔ (۹) طبقات الشافعیۃ، ۸/۳۰۵۔ (۱۰) مستشرق مایرہوف نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ابن نفیس نے خواہ ساتویں صدی ہجری/تیرہویں صدی عیسوی میں دوران روی کی تحقیق پیش کی ہو، لیکن یورپ کے ڈاکٹروں کو اس کی خبر نہ تھی، کیوں کہ ابن نفیس کی کتاب قلمی صورت میں تھی اور اس سے استفادہ عام نہ ہوا تھا۔ لیکن بعض محققین نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ابن نفیس کی یہ تحقیق مختلف واسطوں سے یورپ میں پہنچ گئی تھی اور اہل یورپ نے حسب عادت اس تحقیق کو کسی مسلمان محقق کی جانب منسوب کرنے کے بجائے اپنی تحقیق کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے الرسالۃ الکاملیۃ، مقدمۂ محقق، ص ۶۳-۷۰، الموجز فی الطب تقدیم وتعلیق ڈاکٹر یحییٰ مراد، دار الکتب العلمیۃ بیروت، ۱۴۲۵ھ/۲۰۰۴ء، مقدمۂ محقق، ص ۸-۲۱۔ (۱۱) ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، دار الریان للتراث القاہرۃ، ۱۹۸۸ء، ۱۳/۳۳۱۔ (۱۲) ذہبی، بحوالہ شذرات الذہب، ۵/۴۰۲۔ (۱۳) خیر الدین الزرکلی، الاعلام، دار العلم للملایین، بیروت، ۱۹۹۷ء، ۴/۲۷۱۔ (۱۴) تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے محمد رضی الاسلام ندوی، کلیات طب کے مصادر ومراجع طبع علی گڑھ، ۱۹۹۵ء، ص ۱۰۲-۱۰۳۔ (۱۵) ملاحظہ کیجیے محمد رضی الاسلام ندوی، کتابیات قانون، ڈائمنڈ پرنٹرز دہلی، ۲۰۰۲ء، ص ۲۱-۲۵، کلیات طب کے مصادر ومراجع ص ۱۰۵-۱۰۷۔ (۱۶) الاعلام، ۴/۲۷۱۔ (۱۷) جارج سارٹن، الشرق الأوسط فی مولفات الامریکیین، بحوالہ الرسالۃ الکاملیۃ، مقدمۂ محقق، ص ۱۵۔ (۱۸) صلاح الدین الصفدی، الوافی بالوفیات۔ (۱۹) ابن سینا کی شرح کا قلمی نسخہ انگلینڈ کی ایک لائبریری میں محفوظ تھا۔ مولانا محمد صغیر حسن معصومی نے اس کی تحقیق کی ہے اور مجلہ، المجمع دمشق میں اس کی اشاعت ہوئی ہے۔ (۲۰) الرسالۃ الکاملیۃ، ص ۱۵، مقدمۂ محقق۔ (۲۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے الرسالۃ الکاملیۃ، مقدمۂ محقق کی بحث معارضۃ ابن النفیس قصۃ حی بن یقظان للشیخ الرئیس ابن سینا، ص ۷۹-۸۶۔ (۲۲) تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے الموجز فی الطب، مقدمۂ محقق، ص ۴۳-۴۴۔

الخیر الکثیر ایک تحلیلی مطالعہ

پروفیسر عامر حیات حسینی

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شخصیت اور ان کی تصانیف کا تنقیدی اور تحلیلی جائزہ اس حقیقت کو عیاں کرتا ہے کہ وہ علوم دین کا ایک بحر ذخار ہیں جس کی موجیں مختلف مباحث کی صورت میں ابھرتی نظر آتی ہیں اور ہر موج دوسری موج سے الگ ہونے کے باوجود جڑی ہوئی ہے۔ ان کا مذہبی شعور ہمہ جہت اور تنقیدی نظر بہت گہری ہے۔ ان کو تاریخ، تاریخی عوامل اور تاریخی حرکت کا بھی بہت گہرا شعور ہے، ان کا تنقیدی نکتہ نگاہ انتاجی رموز وادراک کا حامل ہے۔ غلو اور تعصب سے صرف نظر کرتے ہوئے وہ نزاعات کو بہت باریک بینی سے دیکھتے ہیں اور ان میں ایک تطبیق اور صلح کا پہلو نکال لاتے ہیں۔ قرآن پاک اور سنت مطہرہ ان کے تمام فکر کی بنیاد ہے۔ تاریخی طور پر ایک کلاسیکی یا روایتی مذہبی خاندان سے ان کا تعلق ہے۔ ان کی تربیت اسی ماحول میں ہوئی لیکن ان کا تخلیقی وتنقیدی شعور اپنے زمانے سے بہت آگے ہے اور وہ قدیم وجدید کا خوبصورت سنگم نظر آتے ہیں۔

ان کی تصانیف اور مباحث میں معتزلہ، اشاعرہ، ماتریدیہ، اہل حدیث، فلاسفہ اور صوفیہ کے نظریات کا ایک امتزاج نظر آتا ہے۔ لیکن یہ امتزاج خوش رنگ انتخاب کا ہے جس کی تہہ میں بہت گہرا مذہبی، تنقیدی وتخلیقی شعور موج زن ہے۔ افلاطون کی طرح وہ اپنے مطالب اور خیالات مختلف سورتوں سے حاصل کرتے ہیں، لیکن انتخاب اور ان کے مطالب کا اطلاق وہ خود کرتے ہیں اور اسی سے ان کے اپنے نظریات ابھر آتے ہیں۔

شعبہ فلسفہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

فلسفہ یونانی جس کا امام غزالیؒ نے بہت زبردست محاکمہ کیا اور جس کی غیر اسلامی مشرکانہ اور غیر سائنسی روح پر اقبال نے بھی اپنی تشکیل جدید میں بحث کی ہے، اس کا شاہ صاحبؒ نے بہت گہرا مطالعہ کیا۔ انہوں نے اس کے صرف ان پہلوؤں کا انتخاب کیا اور اسے اپنے فکری ڈھانچے سے مربوط کیا جو اسلامی اور سائنسی روح کے مخالف یا متضاد نہیں ہیں۔

اسی طرح تصوف کی پوری تاریخ اور نظریات کا بھی انہوں نے گہرا مطالعہ و محاکمہ کیا۔ چونکہ وہ شیخ الطائفہ حضرت شیخ جنید بغدادیؒ کی طرح خود ایک عملی صوفی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک جید عالم بھی تھے، اسی لیے یک طرفہ، غیر اسلامی، غیر ضروری اور غیر منطقی اظہار وادعا کی بجائے انہوں نے اس کے عملی و نظری پہلوؤں پر ایک جدا بحث کی اور ایک نئے اور حرکی نقطہ نگاہ کے ساتھ ایک واضح دانش مندی کو سامنے لے آئے جس کی جڑیں شریعت مطہرہ میں بہت گہری اور نئے معانی کے امکانات سے مزین ہیں، کیونکہ وہ جمود کے بجائے ارتقاء اور اجتہاد کے قائل ہیں۔

منصور حلاج، امام غزالی، ابن عربی اور شیخ احمد سرہندی کے نظریات کی فہم اور ان میں تطبیق بجائے خود ایک مشکل معاملہ ہے۔ ان چاروں شخصیات نے اسلامی علوم، دینیات، تصوف اور تہذیبی حرکت و شعور کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ ان کے نظریات ایک دوسرے سے بالکل الگ اور ان کے تاریخی اور مذہبی شعور میں بڑا فاصلہ ہے اس پورے تناظر کو ذہن میں رکھیے تو یہ واضح ہونا چنداں مشکل نہیں کہ ان کا محاکمہ اور تخلیقی و تنقیدی شعور کے ساتھ ان میں تطبیق کرنا کتنا مشکل ہے۔

یہ شاہ صاحب کا ہی حوصلہ تھا کہ انہوں نے اس مسئلہ کی طرف توجہ کی۔

امام غزالی نے تمام اسلامی تعلیمات کو اسلام کے اخلاقی نظام سے نہ صرف مربوط کیا بلکہ ان کی ان میں ضابطہ بندی کی۔ اسی طرح یونانی فلسفہ اور ان مسلمان فلاسفہ کی جو اس سے متاثر تھے اور جو تصوف کے غیر اسلامی نظریات و اعمال کا شکار ہوئے ان کے اسلامی تہذیب پر اثرات کو زائل کرنے کی بڑی کوشش کی۔ اس طرح کی سوچ اور منہج شاہ صاحبؒ کے ہاں بھی ملتی ہے۔

انہوں نے ابن عربی کے نظریہ وحدۃ الوجود اور شیخ احمد سرہندی کے نظریہ وحدۃ الشہود کو ہم آہنگ کرنے کی بھی کوشش کی۔

ان دونوں اور دیگر تمام روحانی و متصوفانہ ورثوں کی مختلف ندیوں کو روح جدید کے

تقاضوں کے مطابق روایتی اسلام کے سمندر میں داخل کردیا۔اس منہاج میں ان کی رہنمائی شیخ الطائفہ کے طریق سے ہوتی ہے، جنہیں اس مشن کا سب سے بڑا سرخیل کہا جاسکتا ہے۔اگرچہ ان کا فکری کینوس بہت وسیع نہیں اور اس میں غزالی کو تفوق حاصل ہے۔

شاہ صاحبؒ نے مسلمانوں کو علمی، نظریاتی، اخلاقی، مذہبی اور عمرانی طوائف الملوکی سے باہر لانے کے لیے اسلامی مذہبیات اور فکر کی ایک تشکیل نو کی اور اسے مزید آگے بڑھانے کے لیے راہیں استوار کیں۔جس کی طرف دور جدید میں سرسید احمد خان اور علامہ محمد اقبال نے توجہ کی۔حالانکہ سرسید کا دائرہ عمل مذہبیات، عمرانیات اور تعلیم اور علامہ محمد اقبال کا فلسفیانہ ہے، جس کی عمرانی، مذہبی، دینی، تہذیبی اور تاریخی جہتیں بہت اہم ہیں۔دور جدید میں برصغیر میں اٹھنے والی اسلامی تحریکیں اور تمام مسلمان دانش ور جنہوں نے اسلام، اسلامی تہذیب اور مسلمانوں کے مسائل پر سنجیدگی سے سوچا اور جن میں اقبال کو منفرد مقام حاصل ہے، سب شاہ صاحب سے متاثر ہیں۔جدید نظری تفکر اور تشکیل جدید کے سلسلہ میں شاہ صاحبؒ کا نظریہ اجتہاد بھی ہمہ جہت ہے اور ایک کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔اس کی روح ان کی ہر بحث میں نظر آتی ہے چاہے وہ تصوف سے متعلق ہو یا مذہبیات، سماجیات وعمرانیات سے۔ان کے دلائل اور استدلال میں روشن خیالی، لچک، رواداری اور مصالحت پسندی ایک اصول اور قاعدے کی حیثیت سے نظر آتی ہے۔اجتہاد جیسے عظیم تخلیقی عمل کے لیے یہ طریق خشت اول کی حیثیت رکھتا ہے۔

شاہ صاحبؒ نے پیچیدہ مسائل پر بہت ہی مدلل و مبسوط بحثیں کیں مگر ان کو پیش کرنے میں غیر ضروری طوالت سے احتراز کیا اور زبان وبیان کا ماہرانہ استعمال کیا جو شاعری میں تو ممکن ہے لیکن سیدھی نثر میں ناممکن نہ سہی مشکل ضرور ہے۔اس قدرت زبان کے بہت اعلیٰ نمونے کلام پاک کا فارسی ترجمہ، حجۃ اللہ البالغہ اور خیر کثیر ہیں۔اختصار ان کی تحریروں کا خاصہ ہے اور یہ ان کو مختلف الجہت اور کثیر المعانی بنا دیتا ہے جس کا بہترین ثبوت حجۃ اللہ البالغہ اور خیر کثیر جیسی کتابیں ہیں۔

الخیر الکثیر، حجۃ اللہ البالغہ کی طرح ایک بہت ہی جامع اور کثیر الجہت تصنیف ہے، لیکن اس کی ضخامت حجۃ اللہ البالغہ کے مقابلہ میں بہت تھوڑی ہے، لیکن غور سے دیکھا جائے تو کئی اہم

مباحث کی بناپر جو ابن عربی کی فصوص الحکم اور اشاعرہ اور امام غزالی سے یا تو لیے گئے یا ان سے متاثر ہیں یہ حجۃ اللہ البالغہ سے بھی زیادہ اہم ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کے عنوانات، مباحث اور طرز استدلال نے مجھے چونکا دیا۔ یہ فلسفہ، مابعد الطبیعات، تصوف اور حکمت الاشراق کے مباحث سے گھری ہوئی ہے۔ معرفت ذات، اسمائے الٰہی کی حقیقت، حقیقت وحی، زمان ومکاں، عرش وافلاک، عالم، نبوت اور آخرت، اعیان ثابتہ، مراتب انبیاء، ولایت ومراتب اولیاء جیسے پیچیدہ مسائل پر مبسوط مباحث، عقل وفکر کو مبہوت کردینے والے ہیں۔

یہ مباحث منصور حلاج کی کتاب الطواسین، شیخ الطائفہ کی رسالہ توحید اور غزالی کی جملہ کتابوں میں کئی جہتوں سے تو ملتے ہیں لیکن کسی ایک کتاب میں نہیں ملتے۔

ابن عربی کی فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم میں وجود، نبوت، اعیان ثابتہ، اسماء وصفات، جبر وقدر، مراتب اولیاء اور معراج کے مسائل ہیں۔ جن کی زبان اور بیان، مسائل کی نوعیت کے لحاظ سے بہت ہی مشکل ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو یہ تمام مسائل وجود اور توحید سے منسلک ہیں۔ نور، ولایت اور قطبیت کا مسئلہ ابن عربی سے پہلے طواسین میں مختلف جہتوں سے زیر بحث لایا گیا ہے۔ لیکن امام غزالی نے مشکوٰۃ الانوار اور ابن عربی نے فصوص الحکم میں ان مسائل پر کئی دوسرے زاویوں سے بحث کی ہے۔ اسرار نبوت اور ولایت اور ولایت خاصہ یعنی رسالت کاملہ کا مسئلہ اعیان ثابتہ کے مشکل مسئلہ کے ساتھ منسلک ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ان تمام مسائل پر بحث کی ہے۔ واضح ہے کہ ساری بحث میں وہ ابن عربی کا تتبع کرتے ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود کہ ان پر ابوالحسن اشعری اور امام غزالی کے اثرات واضح ہیں اور یہ بھی کہ وہ شیخ احمد سرہندی کے فلسفہ وحدۃ الشہود کو نظر انداز نہیں کرتے۔ لیکن ان کا یہ کہنا کہ شیخ عربی اور شیخ سرہندی کی فکر کی روح ایک ہے صرف طریقہ بحث الگ الگ ہے۔ ان دونوں نظریات پر دوبارہ غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔ وجہ واضح ہے شیخ الطائفہ، امام غزالی، ابن عربی اور شیخ احمد سرہندی کئی مسائل پر ایک جیسے نقطۂ نظر کے باوجود، ان کے درمیان بنیادی اصولی

اختلاف ہے۔ایک وجہ یہ بھی ہے مشکوٰۃ الانوار میں غزالی کا نور، وجود اور عرفان اور اولیاء سے متعلق رویہ کا تتبع ابن عربی کے فلسفہ میں واضح نظر آتا ہے، حالانکہ غزالی کا یہ رویہ ان کے فلسفیانہ نکتہ نظر سے کلی طور پر میل نہیں کھاتا۔اپنے تصور خدا میں وہ شیخ الطائفہ سے زیادہ نزدیک نظر آتے ہیں۔

الخیرالکثیر کی تصنیف میں شاہ صاحبؒ نے کشف المحجوب اور عوارف المعارف سے بھی استفادہ کیا ہے۔کچھ حد تک یہ کتاب حضرت میر سید علی ہمدانی کی ذخیرۃ الملوک سے بھی ملتی جلتی ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب اپنے منہاج اور استدلال میں لاجواب ہے اور مذکورہ بالا ساری کتابوں سے الگ ہے۔کیونکہ یہ مختلف موضوعات کا مجموعہ بھی ہے اور خلاصہ بھی۔مذکورہ بالا کتابوں میں جو مضامین ملتے ہیں یہ تقریباً ان سب کا ایک مختلف ڈھنگ سے احاطہ کرتی ہے اور ان سے ہٹ کر دوسرے موضوعات سے بھی بحث کرتے ہوئے ایک مربوط فکری نظام کو سامنے لاتی ہے۔اس لیے اس کتاب پر مختلف زاویوں سے مدلل اور مربوط بحث کی ضرورت ہے۔

اس کتاب کے مباحث کا ایک مختصر جائزہ لینے سے پہلے لفظ ''حکمت'' کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے، جس کے بیان سے شاہ صاحبؒ نے اس کتاب کا آغاز کیا ہے۔اس کے معانی اور مضمرات سے یہ کتاب مزین ہے اور شاہ صاحبؒ کے طورِ طرز فکر کی جان بھی یہی لفظ ہے۔

حکمت کا تعلق عنایت ربانی کے ساتھ ساتھ تدبر، تعقل اور تفکر سے بھی ہے۔انتہائی گہرے شعور کے ساتھ مسائل کی تہہ تک جانے اور ان کی کنہ کو سمجھنے اور ان کے کوائف، مضمرات اور نتائج کو جان لینے کا نام حکمت ہے۔حکمت بہترین اور دانش مندانہ فہم، عمل اور فیصلے کو بھی کہتے ہیں۔اس کا تعلق مشکل اور عمیق روحانی اور مابعدالطبعیاتی حقائق اور اسرار و رموز کو سمجھنے اور پانے سے بھی ہے۔اعلیٰ اخلاقی اور تخلیقی اقدار اور قوتوں کی پرکھ اور ان پر صحیح ڈھنگ اور یقین کے ساتھ قائم رہنے کو بھی حکمت کہتے ہیں۔اپنی ذات اور اس کو پیدا کرنے والی ذات حقیقی کو سمجھنے اور اس سے تعلق پیدا کرنے اور اس کے مطالب اور حدود کو سمجھنے کا نام بھی حکمت ہے اور یہی اصل حکمت ہے۔باقی تمام معاملات گویا اس کی فرع ہیں۔عبادات اور معاملات اسی کے ذیل میں آتے ہیں۔عبادات اور معاملات کے صحیح معانی، تناظر اور طریق کا نام بھی حکمت ہے۔حکمت کے معنی علاج و معالجہ کے ہیں۔لیکن اس سے مراد محض جسمانی بیماریوں کا علاج نہیں۔اس سے مراد نفسانی اور

روحانی بیماریوں کا علاج بھی ہے۔اصل میں یہی بیماریاں ہیں۔اگر انسان کے نفس اور نفسانی قویٰ کا علاج نہ ہو اور ان کو گرفت میں لاکر نفس امارہ کو نفس مطمئنہ نہ بنایا جائے تو انسان کی زندگی ہی ناکام ہے۔وہ حیوان کے مرتبہ سے کبھی اونچا نہ اٹھ پائے گا اور حیوان ہی رہے گا اور ان بیماریوں میں دائمی طور پر مبتلا ہوکر اسفل السافلین میں گر جائے گا۔لہٰذا اخلاقی تربیت اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کی ترویج اور زندگی میں ان کا عملی نفاذ جو انسان کو اعلیٰ روحانی اور انسانی اور تہذیبی مرتبے پر لے جاتا ہے۔وہی اصل حکمت کا جزو لاینفک ہے۔یہ بات سمجھنے کی ہے کہ اعلیٰ اخلاقی اقدار ہی روحانی اقدار ہوتی ہیں اور یہی انسان کی مابعد الطبیعاتی بنیاد سے وابستہ ہوتی ہیں، کیونکہ غور سے دیکھا جائے تو یہ خدا ہی کی صفات یا ان کے مختلف پیرایوں کا اظہار ہے۔

حکمت نہ ہو تو انسان وجود مطلق اور اس کے اسماء وصفات اور ان کے شیون کو نہیں سمجھ سکتا۔حضرت شاہ صاحبؒ نے لفظ ''حکمت'' پر بحث کے ساتھ ہی اس کتاب کی شروعات کی ہے اور اسے ''خیر کثیر'' کا نام دیا ہے۔فلسفہ ومنہاج غزالی کی صحیح فہم ہو تو ''خیر کثیر'' سعادت ابدی کے مترادف بھی ہے، جو انسان کے تمام مادی، جسمانی اور روحانی سفر اور ارتقاء کا نتیجہ ہے۔اگر یہ خیر اور محاسن کے دائرے میں ہو۔اس سفر اور ارتقاء کا نتیجہ کامیابی، رضائے الٰہی اور دیدار الٰہی کے حصول کی صورت میں سامنے آتا ہے۔اس سے بڑی کامیابی اور خیر کی بات کیا ہوسکتی ہے۔ رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ ۔اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے، یہی فرمان الٰہی ہے۔

اور یہی اس کی حیات ابدی کا ضامن ہے۔یہ مسئلہ اقبال کے فلسفہ میں بھی کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔''تشکیل جدید'' میں اقبال نے اس نکتہ یعنی ''حیات دوام'' پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے۔اس بحث کا ایک اہم نکتہ زمان و مکان کی حقیقت سے متعلق بھی ہے جس پر شاہ صاحب نے ''الخیر الکثیر'' میں بحث کی ہے۔

لیکن اس مسئلہ کی کنہ تک پہنچنے کے لیے اسلامی فلسفہ کے اولین مکاتب معتزلہ اور اشاعرہ کے نکتہ نظر سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ تمام اسلامی فلاسفہ، مکاتب فلسفہ اور مذاہب نے ان سے استفادہ کیا ہے۔شاہ صاحبؒ اور علامہ محمد اقبال کی تحریروں میں بھی ان سے

استفادہ کی جھلک نظر آتی ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ بار بار ابوالحسن علی اشعری جنہیں وہ امام اہل سنت کے نام سے یاد کرتے ہیں کے متکلمانہ نکات اور مباحث کو سامنے لاتے ہیں۔ جدید فلسفیانہ توجیہات کے ساتھ اس مسئلہ پر اقبال نے بحث کی ہے۔ ان مباحث پر بہت گہرائی سے بحث کرنے کی ضرورت ہے اور اسی سے حضرت شاہ صاحب کے فلسفہ زمان و مکان کی، جس پر ابھی کوئی کام ہوا ہی نہیں ہے، گرہیں کھل سکتی ہیں۔

یہاں یہ بات کہنا ضروری ہے کہ شاہ ولی اللہ کا فلسفیانہ نظام دیکھنے میں جتنا آسان لگتا ہے، حقیقت میں اتنا آسان بھی نہیں۔ یہ نظام بہت ہی تہہ دار، پیچیدہ اور مختلف اجزاء سے مرکب و مربوط ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک پیچیدہ عقلی، مذہبی، عمرانی اور روحانی نظام کو سامنے لاتا ہے جو مختلف روحانی، عقلی، فلسفیانہ، دینیاتی اور عمرانی مسائل و عوامل کو مربوط کرتے ہوئے اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید کی طرف پیش رفت کرتا ہے۔

خیر کثیر اسی فکری نظام کا ایک مختصر و مربوط خاکہ سامنے لاتا ہے۔ میں نے ایسا اس لیے کہا کہ اس میں مابعد الطبعیاتی، دینیاتی اور متصوفانہ مسائل پر بحث تو ہے لیکن عمرانیات پر کوئی بحث نہیں ملتی جو حجۃ اللہ البالغہ اور ازالۃ الخفا کا خاصہ ہے۔

خیر کثیر کا تنقیدی مطالعہ اس بات کا متقاضی ہے کہ اس میں بیان کردہ مباحث کو خلط ملط کرنے کی بجائے ان کی موضوعاتی درجہ بندی کی جائے تاکہ ان کے صحیح معانی کا ادراک کرنے کے بعد ان کی معنوی، علمی اور عملی تطبیق آسان ہو سکے۔

اس کتاب کے مباحث کو میں نے مندرجہ ذیل موضوعات میں تقسیم اور درجہ بند کیا ہے۔ ۱-دینیات، ۲-فلسفہ، ۳-علمیات، ۴-علم الکلام، ۵-تصوف، ۶-تاریخ اور اختلاف صحابہؓ، ۷-تفسیر و حدیث اور ۸-دینیات اور علم الکلام کے مشترک مسائل۔

جن مسائل پر خیر کثیر میں بحث ہوئی ہے میں نے مندرجہ بالا منہاج کی روشنی میں ان کو یوں درجہ بند کیا ہے:

تصوف: حضرت محدث دہلوی نے تصوف کے سولہ اہم مسائل پر اس کتاب میں بحث

کی ہے جو خاصی پیچیدہ ہے۔ وہ مسائل یہ ہیں۔ وجود اور اس کی ماہیت، وحدۃ الوجود، اعیان ثابتہ، عوالم، انبیاء علیہم السلام کے اعیان کی تقسیم، نور نبوت کے چار طبقے، ولایت اور اس کے اقسام، قطب کی حقیقت، قبض و بسط، فنا کی تفصیل اور اس کی قسمیں، اہل صفا اور ان کے طریقے، طریقہ ابرار، قرب کی حقیقت، قرب وجود، قرب نوافل اور قرب فرائض، کلام نفسی، شعر و شاعری اور موسیقی اور شان نبوت، اس میں سے دس اولین مباحث ایسے ہیں جن کا احاطہ ابن عربی نے فصوص الحکم میں کیا ہے اور یہ بحث انبیاء کے اعیان کے حوالے سے کی گئی ہے، فصوص الحکم کا سارا محور یہی اعیان ہیں لیکن شاہ صاحب نے انبیاء کے اعیان ثابتہ پر کوئی الگ کتاب نہیں لکھی، بلکہ خیر کثیر میں ایک طویل بحث ہے جو ابن عربی سے مستعار ہے۔

دیگر مسائل کا تصوف کی دوسری اہم کتابوں میں بیان ہے، جن میں غزالی کی احیاء اور مشکوٰۃ کو ایک خاص حیثیت حاصل ہے۔

لیکن اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ شاہ صاحب نے محض ان کی نقل کی ہے۔ شاہ صاحب کا رویہ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے ایک انتخابی مفکر کا ہے، انہوں نے مسائل ضرور یہ دیگر صوفیہ اور فلاسفہ سے لیے ہیں، لیکن ان پر اپنے مخصوص مفکرانہ اور تنقیدی نکتہ نگاہ سے بحث کی ہے، جس کا احاطہ یہاں ممکن نہیں البتہ ضرورت کے مطابق کہیں کہیں اشارات و کنایات میں ان کا مختصر بیان ہوگا۔

فلسفہ کے دو اہم مسائل خیر و شر اور زمان و مکان پر اس کتاب میں بحث ہے۔ یہ بحث اشاعرہ کے فکر سے مربوط ہونے کے باوجود جدید فلسفیانہ نکتۂ نظر کے زیادہ قریب نظر آتی ہے۔

علم الکلام کے جن مسائل سے اس کتاب میں بحث کی گئی ہے وہ بہت ہی مشکل دقیق اور پیچیدہ ہیں جیسے ایمان کی تعریف، فلسفہ خیر و شر کی حقیقت، تقدیر اور تقدیر مبرم اور تقدیر معلق۔ اس کے علاوہ اشعری مذہب پر ایک بحث ہے۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ ان مسائل پر محض علم الکلام میں ہی بحث نہیں بلکہ مفسرین، محدثین اور فلاسفہ نے بھی تقدیر اور خیر و شر پر بحثیں کی ہیں۔ کیونکہ یہ مسائل محض علم الکلام کا مسئلہ نہیں ہیں بلکہ مذہب، فلسفہ اخلاقیات اور عمرانیات کے انتہائی مشکل اور اہم مسائل بھی ہیں۔ صوفیہ میں امام غزالی اور ابن عربی نے ان مسائل کو اپنے فکری نظام میں ایک

اہم مقام دیا ہے۔ ابن عربی نے تقدیر پر اپنی بحث میں اس کی رضا اور مشیت الٰہی کی درجہ بندی کی ہے اور اسی کے حوالے سے خدا اور انسان کے تعلق اور انسان کی ذمہ داری و جواب دہی کا بیان کیا ہے۔ امام غزالی اشاعرہ کے نقطۂ نظر کو سامنے لاتے ہیں اور بالآخر ایک قسم کی جبریت کا اقرار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن جب تشکیل اور اجتہاد کا مسئلہ سامنے ہو تو جبریت کا فلسفہ کسی نہ کسی صورت میں ناقابل قبول اور عمل بن جاتا ہے۔ اسی لیے یہ مسئلہ شاہ صاحب کے لیے بھی بہت اہم ہے اور دور جدید میں علامہ اقبال کے لیے بھی۔

علمیات فلسفہ کی ایک اہم اور اساسی شاخ ہے، جو علم کی حقیقت، اس کے مصادر اور مسائل سے بحث کرتی ہے۔ شاہ صاحب علمیات کے جن مباحث کو زیر بحث لائے ہیں وہ یہ ہیں، حکمت اور وحی کا فرق، وحی کے اقسام، وحی اور الہام میں فرق، معرفت، علم حضوری، علم حصولی، ادراکات، وجود ذہنی، خارق عادت علوم کا مفہوم اور ان کے اقسام۔ علمیات کے ان مسائل پر فلاسفہ، محدثین، مفسرین، متکلمین اور صوفیا نے مدلل بحثیں کی ہیں۔ جن میں یعقوب الکندی، ابن سینا، رازی، ابن حزم، ابن تیمیہ، معتزلہ، اشاعرہ، شیعہ مفسرین و متکلمین، خاصے اہم ہیں۔ سنی مفسرین و محدثین کا تذکرہ میں اس لیے نہیں کر رہا ہوں کہ ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ صوفیہ کے ذیل میں امام غزالی کو ایک اساسی حیثیت حاصل ہے، کیونکہ انہوں نے فلسفہ و مذہب کے تمام پیچیدہ مسائل پر بہت ہی طویل بحثیں کی ہیں، علمیات ان کے سارے فلسفہ اور تصوف کی بنیاد ہے، احیاء العلوم میں اس پر بہت ہی طویل بحث ہے جو تصوف، فلسفہ اور مذہب، عمرانیات اور اخلاقیات کے پیچیدہ مسائل سے مربوط ہے۔ اس کے واضح اثرات شاہ صاحب کے مباحث میں نظر آتے ہیں۔ دور جدید میں علامہ محمد اقبال نے تشکیل جدید میں غزالی کی علمیات پر بحث کی ہے جو جدید فکری تناظر میں بہت ہی اہم ہے۔ اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اگر جدید مغربی فلسفہ کا مطالعہ کیا جائے تو ڈیکارٹ، اسپنوزا اور کانٹ پر غزالی کے اثرات واضح ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مغربی فلاسفہ نے جو چیزیں مشرق سے لی ہیں، ان کا کبھی انہوں نے اقرار نہیں کیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ منہاج شک، علت و معلول اور عقل کی نارسائی، جو ڈیکارٹ، اسپنوزا اور کانٹ کے اہم فلسفیانہ مباحث ہیں، غزالی سے پہلے مغربی و مشرقی فلسفہ میں دور تک ان کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ اسپین کی تباہی کے بعد علوم اسلامیہ کا جو خزانہ مغرب کے

ہاتھ لگا اور جس سے اس نے استفادہ کیا، اظہر من الشمس ہے لیکن اس المیہ کو کیا کہا جائے کہ اس نے اس کا اعتراف کبھی نہیں کیا۔

مذہبیات و دینیات سے متعلق جن مسائل پر کتاب میں بحث کی گئی ہے وہ یوں ہیں، عبادت وحی کی تفصیل، لوح وقلم کی حقیقت، فلسفہ موت، موت کے بعد احوال عذاب، آخرت اور اس کی اقسام، مسئلہ مہدی اور عیسیٰ علیہم السلام، قرب قیامت اور لوگوں کے اقسام، شفاعت اور حوض کوثر کی حقیقت، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، عمرہ اور جہاد، اذکار و تلاوت کی حقیقت اور ان کے تمثلات، کبائر ذنوب اور معجزات کا بیان۔ ان مسائل میں کبائر ذنوب اور معجزات اور شفاعت اور کوثر اسلام کے ابتدائی مذہبی مکاتب اور علم الکلام کے اہم مسائل رہے ہیں۔

دینیات اور علم الکلام کے مسائل میں ایمان اور کفر کی حقیقت بڑا اہم مسئلہ رہا ہے یہ مسئلہ بھی کتاب میں زیر بحث آیا ہے۔

علم تفسیر واحادیث کے جن مسائل پر خیر کثیر میں بحث کی گئی ہے وہ یہ ہیں، تفسیر کی قسمیں، نزول احکام، نسخ کے احکام، قرآن مجید کے ارتقائی منازل، قرآن مجید کے علم کی سات قسمیں، کلام مقدس کی مختلف سورتیں اور تحریف اور اس کی اقسام، حروف مقطعات اور حدیث جاننے کے دو طریقے وغیرہ، تاریخ اور اختلاف صحابہؓ کے عنوان کے تحت جو مسائل زیر بحث آئے ہیں، وہ یہ ہیں اختلاف صحابہؓ کی وجوہات، بہتّر فرقوں کا بیان اور فرقہ ناجیہ کا تعینِ ظاہر ہے یہ سارے مباحث واضح تنقیدی شعور کے ساتھ ایک انتہائی مدلل تحلیل کے متقاضی ہیں۔

عباس محمود العقاد کی خودنوشت سوانح ''أنا''

ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی

عباس محمود العقاد (۱) کی خودنوشت سوانح حیات ''انا'' عصر حاضر کی ان چند اہم اور معروف عربی تصانیف میں سے ایک ہے جس سے اس عہد کے ادبی رجحانات و میلانات اور افکار و خیالات کی تفہیم و توضیح میں کافی مدد ملتی ہے۔ عقاد جدید عربی ادب کے ممتاز اور نمایاں ادیب تھے۔ اپنی محنت، لگن اور سعی مسلسل کی بدولت انہوں نے اپنے معاصرین کے درمیان اہم مقام حاصل کیا۔ ادب، تنقید، صحافت، شاعری اور سیرت نگاری میں ان کی خدمات کو ہر جانب سے خراج تحسین پیش کیا گیا۔ وہ ایک ہمہ جہت اور کثیر التصانیف ادیب تھے۔ ان کی تحریروں سے فکر و نظر کے بہت سے اہم گوشے اجاگر ہوئے اور بہت سی اہم اصناف سخن کو نیا رنگ و آہنگ ملا۔

''انا'' عقاد کی باضابطہ تصنیف نہیں ہے۔ بلکہ یہ ان کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جن میں سے زیادہ تر مشہور مصری مجلّہ ''الہلال'' کے مطالبہ پر تحریر کیے گئے تھے اور اسی میں شائع بھی ہوئے۔ البتہ ان میں سے بعض دوسرے مصری جرائد مثلاً ''الصور'' اور ''القافلۃ'' وغیرہ میں بھی شائع ہوئے تھے۔ ان سب مقالات کو ان کے دوست اور مشہور مصری ادیب ''طاہر احمد الطناجی'' نے کتابی شکل میں یکجا کر دیا اور اس کا نام ''أنا'' (۲) رکھا۔ وہ اس نام کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ناظرین میری رائے سے ضرور اتفاق کریں گے کہ یہ عنوان اس کتاب کے مضامین کے لیے بہت زیادہ موزوں ہے کیونکہ اس میں عقاد کی ذاتی و نفسیاتی زندگی کا تذکرہ ہے۔ اگر عقاد مرحوم زندہ ہوتے تو اس عنوان کو نامنظور نہ کرتے۔ کیونکہ وہ الہلال میں نشر ہونے والے بعض مقالات کے عنوان اور

ایسوشی ایٹ پروفیسر عربی، شعبہ کلیات، طبیہ کالج علی گڑھ۔

بعض کتابوں کے نام کی تعیین کا کام میرے حوالہ کردیتے تھے۔انہیں یہ بھروسہ تھا
کہ میں مناسب نام منتخب کرتا ہوں''۔(۳)

اس کتاب میں صرف ان ہی مقالات کو یکجا کیا گیا ہے جن میں مصنف نے اپنی زندگی اورنفسیاتی،فکری اورادبی خصوصیات بیان کی ہیں۔یہ کتاب کل نوفصلوں پر مشتمل ہے اور ہر فصل کے تحت کئی چھوٹے چھوٹے مقالات ہیں۔کسی فصل کا کوئی ایسا نام متعین ہے جواس کے مقصد اور غرض وغایت کوواضح کردے۔ان فصلوں کے مطالعہ سے مصنف کی شخصیت کے کچھ گوشے بہرحال نمایاں ہوجاتے ہیں۔اور شخصیت کے ارتقائی مراحل سے کسی حد تک واقفیت بھی ہوجاتی ہے۔

پہلی فصل میں جس میں کل چھ چھوٹے چھوٹے مقالات ہیں،مصنف نے اپنے اوراپنے والدین،شہر،بچپن اورعید کے بارے میں گفتگو کی ہے۔اپنے بارے میں سب سے پہلے انہوں نے یہ بتایا کہ عام طور سے لوگ ان کی جوتصویر پیش کرتے ہیں اس سے انہیں شدید اختلاف ہے۔وہ یہ تو نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں کس روپ میں پیدا کیا۔(۴) البتہ متکبر،سخت دل،کتابوں کا کیڑا، غور وفکر میں مستغرق،جذبات سے عاری اور غیر معمولی حد تک خشک مزاج ثابت کرنے کی مہم سے اختلاف کرتے ہوئے وہ اپنی تصویر اس طرح پیش کرتے ہیں:

''میں انتہائی منکسر المزاج اور نرم دل انسان ہوں۔کتابوں سے میرا تعلق جینے کے لیے ہے۔مجھ پر ہر لمحہ دل وجذبات کا غلبہ رہتا ہے......میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ عباس العقاد کی بعینہٖ یہی تصویر ہے،لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ یہ روپ اس سے زیادہ قریب اوراس کی شخصیت کا صحیح ترجمان ہے۔اس روپ میں میں اسے پہچان سکتا ہوں اور ہوسکتا ہے کہ دوسرے بھی پہچان لیں''۔(۵)

اس کے بعد انہوں نے اپنی منکسر المزاجی اور نرم دلی کی مثالیں بیان کی ہیں اور یہ بتایا ہے کہ انہوں نے مال ودولت،علمی اعزازات وخطابات اور جاہ ومنصب کوٹھکرا کرادب وثقافت کے ذریعہ عزت وسربلندی کے حصول کی جوکامیاب کوشش کی اس پرانے بتوں کے پجاری ان سے سخت ناراض ہیں۔وہ ان کے خلاف حسد اور انتقام کی آگ میں جل رہے ہیں اوراپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے تکبر،دغا اور فخر وغرور کا الزام لگاتے ہیں۔انہوں نے اپنی گوشہ نشینی اور

خلوت پسندی کو اپنے مزاج اور فطرت کا لازمی حصہ بتایا ہے۔اس کے بعد بعض ایسے ذاتی اوصاف کا ذکر کیا ہے جس سے ایک طرف ان کی طبیعت کی نرمی کا اندازہ ہوتا ہے تو دوسری طرف بعض اصولوں کے تئیں ان کی سختی کا ثبوت ملتا ہے۔لیکن درحقیقت اس میں ان کی طرف سے کوئی بناوٹ، تکلف یا فخر وغرور کا شائبہ نہیں ہوتا۔

ان کے بیان کے مطابق ان کی پیدائش ۲۸؍جون ۱۸۸۹ء کو ''اسوان'' شہر میں ہوئی۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز نو سال کی عمر میں ہوگیا تھا۔انہوں نے پہلی نظم علم سے متعلق لکھی۔۱۹۰۴ء میں جب کہ ان کی عمر محض پندرہ سال تھی، مدرسہ تعلیم سے فارغ ہوکر انہوں نے حکومت میں ملازمت کرلی لیکن وہاں ملازمین کے استحصال اور ان پر ظلم سے کبیدہ خاطر ہوکر قاہرہ واپس لوٹ آئے اور ''مجلس الفنون والآلات'' اور لسانیات اکیڈمی کے ممبر بنے۔(۶)

ان کے دادا دمیاط کے باشندے تھے اور ریشم کا کاروبار کرتے تھے۔ریشم بٹنے کی مناسبت سے ان کے والد کا لقب عقاد ہوگیا اور پھر یہ خاندان کے تمام لوگوں کے نام کا جزو بن گیا۔ان کے والد بے حد متقی، پرہیزگار اور متدین تھے۔بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں غیر معمولی حد تک سنجیدہ بلکہ سخت واقع ہوئے تھے۔(۷) اس سخت گیری کی بہت سی مثالیں کتاب میں بکھری ہوئی ہیں۔لیکن ایک مثال خاص طور سے قابل ذکر ہے۔اس سے عقاد کی ضد کا بھی ایک نمونہ سامنے آتا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''والد صاحب چاہتے تھے کہ دس سال سے کم ہی عمر میں میں نماز کا پوری طرح پابند ہوجاؤں۔اس سلسلہ میں صبح کی نماز کا معاملہ میرے لیے بے حد مشکل ہوتا تھا۔میں صبح کو بہ مشکل تمام بستر چھوڑتا تھا۔ایک مرتبہ میں نے سرکشی میں بیدار کرنے والے سے کہہ دیا کہ جاؤ میں نہیں اٹھتا اور نماز نہیں پڑھتا۔والد صاحب یہ سن کر چیخ پڑے اور بولے کہ تم نماز نہیں پڑھو گے اور پھر چھڑی اٹھالی۔ یہ دیکھ کر میری ضد ختم ہونے کے بجائے اور بڑھ گئی میں نے ''ہاں'' کہہ دیا۔یہ سن کر وہ خاموش ہوگئے لیکن بہت دنوں تک مجھ سے بات چیت نہیں کی۔حالانکہ ہم لوگ صبح و شام کھانے کے لیے ایک ساتھ ہی بیٹھا کرتے تھے''۔(۸)

والد صاحب صوبہ اسوان میں ''محفوظات'' کے سکریٹری تھے۔ بہت ایمان دار اور محنتی آدمی تھے۔ غلط طریقوں سے مال و دولت حاصل کرنے سے سخت بیزار اور متنفر تھے۔ اعزہ و اقارب کا خیال رکھتے اور تحفے تحائف کا تبادلہ کرتے تھے۔ عزت وناموس کا بہت پاس ولحاظ تھا۔ دینی کتابوں سے محبت تھی۔ وطنی تحریک سے بھی ان کو دلچسپی تھی اور بعض وطن پرست اخبارات و جرائد کے خریدار تھے۔(۹)

والدہ ایک کرد خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہ خاندان دیار مکہ سے کوچ کر کے سوڈان میں مستقل طور سے سکونت پذیر ہوگیا تھا۔ والدہ اور ان کے آبا و اجداد بڑے متقی، شریف غیور اور بہادر تھے۔ ان کی ایمان داری، تقویٰ اور بہادری کے بہت سے واقعات لوگوں کو معلوم تھے۔ والدہ بھی اپنے آبا و اجداد کی مذکورہ صفات سے متصف تھیں۔ انہیں اپنے بزرگوں سے خاموشی اور گوشہ نشینی بھی وراثت میں ملی تھی۔ اس کا سبب تکبر ہرگز نہیں تھا۔ بلکہ یہ ان کا طبعی میلان اور پیدائشی عادت تھی۔ ان کی والدہ ان سے بے حد محبت کرتی تھیں۔ البتہ انہیں بیٹے کے کاغذ، قلم والے کام سے نفرت تھی۔ وہ اسے ان کی تجرد کی زندگی کا بنیادی سبب قرار دیتی تھیں۔ بڑی منتظم مزاج تھیں۔ اخراجات میں میانہ روی اور مالی دشواریوں پر قابو ان کا خاص ملکہ تھا۔(۱۰)

اپنے شہر کا تعارف کراتے ہوئے عقاد نے اس کی دینی، ادبی، علمی اور فنی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے۔ اور عہد فراعنہ سے لے کر عہد اسلامی تک کے تمام ارتقائی مراحل پر اختصار سے گفتگو کی ہے۔ وہ اس کے فطری مناظر اور قدرتی وسائل کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ:

> ''اگر مجھے دنیا کے کسی گوشے میں پیدا کر کے یہاں آنے کا اختیار دیا جاتا تو میں اسے فوراً منتخب کر لیتا۔ کیونکہ یہاں میرے ذوق کی بہت سی چیزیں فراہم ہیں''۔(۱۱)

وہ اس شہر کو ماضی وحال کی تاریخ کا سنگم قرار دیتے ہیں۔ یہاں مختلف قوموں اور ملکوں کے باشندے مقیم ہیں۔ اور اس شہر کو اپنی مادرِ علمی اور مدرسہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس شہر کی آب وہوا نے ان کے ادب میں یکسانی، سیاسی فکر میں عالم گیری اور وطنی وقومی تصور میں آفاقیت عطا کی ہے۔(۱۲)

وہ اپنے بچپن کی بعض یادوں کا ذکر کرتے ہیں۔لیکن اس سے پہلے قوت حافظہ کے بارے میں یہ دلچسپ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ یہ کسی معین ضابطہ کا پابند نہیں اور اپنی خواہش کے مطابق امور و واقعات کو یاد رکھتا یا بھلاتا ہے۔واقعات کے حجم یا زمانے کے قرب و بعد کا اس میں کوئی دخل نہیں۔کبھی کوئی انتہائی معمولی واقعہ پچاس یا سو سال تک حافظہ میں باقی رہتا ہے اور کبھی کوئی غیر معمولی واقعہ چند دنوں یا ہفتوں کے بعد ذہن سے محو ہو جاتا ہے۔(۱۳)

مذکورہ نظریہ کے مطابق وہ اپنے بہت سے یادگار واقعات کو بطور مثال پیش کرتے ہیں۔ تین سال کی عمر میں ایک درگاہ کی زیارت، سات سال کی عمر میں ہیضہ کی وبا، اور دس سال کی عمر میں ایک سبک اندام یورپین لڑکی کا مشاہدہ اور اس کی تصویر کشی، خاص طور سے قابل ذکر واقعات ہیں۔(۱۴) انہیں بچپن ہی سے انشاء پردازی اور مطالعۂ کتب کا بے پناہ شوق تھا۔اسوان کے مدرسہ میں مضمون نویسی کے لیے جو موضوعات دیے جاتے تھے۔ان میں دو چیزوں کے درمیان تقابلی پہلو ہمیشہ ملحوظ رکھا جاتا تھا۔عقاد ہمیشہ کمزور پہلو کی حمایت میں مضمون لکھا کرتے تھے۔ان کے استاذ ان کی اس روش کو پسند کرتے تھے۔کیونکہ اس سے قلم میں پختگی آتی ہے۔ایک مرتبہ شیخ عبدہ مدرسہ کا معائنہ کرنے آئے تو استاذ نے ان کی کاپی ان کے سامنے رکھی۔انہوں نے بعض عنوانات کے بارے میں کچھ سوالات کیے۔اس پر متوجہ ہو کر یہ جملہ کہا ''آیندہ یہ لڑا بڑا انشاء پرداز ہوگا''۔عقاد کہتے ہیں کہ اس جملہ کا مجھ پر بہت اثر پڑا۔یہیں سے میرے اندر انشاء پردازی کا عزم و شوق پیدا ہوا جو برابر ترقی کرتا رہا۔(۱۵)

مطالعۂ کتب کے شوق کا عالم یہ تھا کہ انہوں نے اپنے ذاتی اخراجات سے پیسے بچا کر بہت سی قیمتی اور مفید کتابیں خریدی تھیں۔حالانکہ وہ اوسط درجہ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ان کو صرف بقدر ضرورت ہی رقم ملا کرتی تھی۔جس سے بآسانی کتابوں کی خریداری ممکن نہیں تھی، وہ اپنی خریدی ہوئی کتب کے علاوہ اپنے والد کی مذہبی کتابوں، مختلف رسائل و جرائد اور مدرسہ کی لائبریری سے بھی برابر استفادہ کرتے رہتے تھے۔(۱۶) ایک بار ایک مسلمان انگریز سیاح سے ان کی ملاقات ہوئی۔اس نے وطن واپس جا کر ان کے لیے قرآن مجید کا ترجمہ اور کارلائل کی کتاب ''انقلاب فرانس'' بطور ہدیہ بھیجی۔عقاد کہتے ہیں کہ ان کتابوں سے مجھے مطالعہ میں بہت مدد ملی۔

جب میرے مطالعہ میں وسعت ہوئی تو میں اس حسن انتخاب سے بہت خوش و متاثر ہوا۔ کیونکہ مطالعہ کے لیے بنیادی عقائد اور معاشرتی انقلاب کے فلسفہ ہی کی اہمیت ہے۔(۱۷)

عقاد نے عید کے تعلق سے اپنی بعض یادداشتوں کو قلم بند کیا ہے۔ غروب آفتاب کے بعد ہی سے مبارک بادیوں کے تبادلے، عورتوں کی قبرستان کی زیارت، مردوں کی تقسیمِ صدقہ و خیرات، نئے نئے کپڑوں کی تیاری، بچوں کو خاص طور سے نہلانے دھلانے، انہیں نظر بد سے بچانے کے لیے دوسرے کے سامنے برا بھلا کہنے، عیدی کی تقسیم، اس کے لیے بچوں کی کشمکش اور بڑے بوڑھوں سے اس کا مطالبہ، یہ اور اس طرح کی بہت سی باتیں عید کے تعلق سے اس خودنوشت میں آگئی ہیں۔(۱۸)

دوسری فصل میں انہوں نے اپنے اساتذہ، انشاء پردازی کے محرکات اور سرکاری ملازمت سے علاحدگی کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ اساتذہ کے بارے میں سب سے پہلی بات انہوں نے یہ بتائی کہ انہیں اپنے اساتذہ کو خود منتخب کرنے کا موقع ملا۔(۱۹) یہ تمام لوگ تصنیف و تالیف کے میدان میں نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ وہ ان میں سے جس سے جب چاہتے استفادہ کرتے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے اساتذہ کی علمی حیثیت، طریقہ درس، ان سے اخذ و استفادہ کی مقدار اور ان کے ساتھ گزرے بعض اہم واقعات کا ذکر کیا ہے۔ جن اساتذہ کے نام صراحت سے ذکر کیے ہیں۔ ان میں ادب اور تاریخ کے استاذ شیخ محمد فخر الدین اور والد کے متعین کردہ استاذ شیخ احمد الجداوی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اسی دوران انہوں نے شیخ محمد عبدہ کا بھی بڑی عقیدت اور احترام سے ذکر کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ انہیں اپنا روحانی معلم تصور کرتے تھے اور ان کے بعض تحسینی جملوں کو اپنے لیے مشعل راہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنے بعض ساتھیوں کی شرارتوں کا حال بھی بیان کیا ہے۔(۲۰)

انشاء پردازی کے محرکات میں انہوں نے حوصلہ افزائی کے کلمات، مساعد حالات اور شوق و ذوق کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ وہ ان تینوں محرکات کی موجودگی کو انشاء پردازی کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں۔ اگر کسی کی حوصلہ افزائی کی گئی لیکن اسے مناسب حالات میسر نہیں آئے تو اس سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ اسی طرح حوصلہ افزائی اور مناسب حالات کے ساتھ اگر

انسان کے اندر خود رغبت نہ ہو تو ایسی صورت میں بھی کامیابی ممکن نہیں ہے۔ اپنے بارے میں ان کا یہ خیال ہے کہ ان کی انشاء پردازی میں تینوں عوامل اور محرکات شامل ہیں۔(۲۱) اساتذہ کی طرف سے ان کی برابر حوصلہ افزائی ہوتی رہی شیخ محمد عبدہ نے یہ کہہ کر'' ما اجدر هذا ان یکون کاتبا بعد''۔ اس پر آخری مہر ثبت کردی۔(۲۲) بچپن ہی سے مطالعہ اور مضمون نویسی میں منہمک رہتے تھے۔'' العروة الوثقی '' اور'' الأستاذ'' ان کے زیر مطالعہ رہتے تھے۔ بعد میں حالات نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ احمد لطفی السید اور ابوشادی جیسے مایہ ناز ادیبوں اور مقالہ نگاروں کے رسائل'' الجریدة'' اور'' الظاهر'' میں ان کے مقالات شائع ہوئے، حسن اتفاق سے استاذ فرید وجدی جیسے ایمان دار، صادق اور مخلص آدمی کے ساتھ ان کے اخبار''الاستور''میں باقاعدہ صحافتی زندگی کے آغاز کا موقع ملا۔ وہ اخبار کے بند ہونے تک اس میں کام کرتے رہے۔ استاذ فرید وجدی کی ایمان داری اور اصول پسندی سے وہ بہت متاثر ہوئے۔(۲۳)

وہ سرکاری نوکری سے اپنی علاحدگی کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔ ۱۹۰۷ء کے آس پاس انہوں نے اخبار''الجریدة''میں''الاستخدام رق القرن العشرین''کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا۔ اس میں انہوں نے ملازمت کے نقصانات اور منفی پہلوؤں کا نقشہ کھینچا ہے۔(۲۴) اس کے کچھ ہی دنوں بعد انہوں نے ملازمت چھوڑ کر صحافت اختیار کرلی۔ وہ اپنے اس اقدام پر بہت مسرور اور مطمئن تھے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے انہیں ملازمت سے چھٹکارا حاصل کرنے کی توفیق عنایت کی۔ عقاد کی اس نفرت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ انسان اس میں محدود، مقید اور پابند ہوکر رہ جاتا ہے اسی لیے وہ اسے غلامی اور اسیری کا ہم معنی اور مترادف قرار دیتے ہیں۔(۲۵)

تیسری فصل میں انہوں نے چھ موضوعات پر الگ الگ مختصر انداز میں گفتگو کی ہے۔ ان کے عناوین اس طرح ہیں:''میرا قلم، میں نے مطالعہ کیوں پسند کیا؟، میری پسندیدہ کتابیں، میری مقالہ نگاری کا طریقہ، کتابوں کی تصنیف وتالیف کا ڈھنگ، میں نے کیا لکھا اور کیا لکھنا چاہتا ہوں''۔

''میرا قلم'' کے تحت انہوں نے اپنے قلم کی شکل وصورت واضح کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ مختلف اوقات میں انہوں نے کس طرح کا قلم استعمال کیا ہے۔ اس کی روشنائی کیسی تھی؟ اپنے

استعمال کردہ تین قلم خاص طور سے انہوں نے محفوظ رکھے تھے۔ لیکن بعد میں یہ سب ضائع ہوگئے ۔(۲۶) ''مطالعہ کا شوق کیوں''؟ کے تحت سب سے پہلے اس خیال کی تردید کی ہے کہ مطالعہ کا مقصد لکھنے کا شوق نہیں ہونا چاہیے۔ وہ مطالعہ کے بعض پہلوؤں اور مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے مقصد مطالعہ کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

> ''مجھے مطالعہ سے دلچسپی لکھنے کے لیے نہیں اور نہ اس لیے کہ اس سے عمر میں حسابی لحاظ سے اضافہ ہو بلکہ مطالعہ سے مجھے اس لیے محبت ہے کہ دنیا میں مجھے صرف ایک ہی زندگی ملی ہے جسے میں اپنے ضمیر کی تحریک کے لیے ناکافی سمجھتا ہوں اور مطالعہ ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے ایک ہی زندگی میں متعدد زندگیاں مل سکتی ہیں۔ کیونکہ اس سے انسان کی زندگی میں گہرائی پیدا ہوتی ہے''۔(۲۷)

پسندیدہ کتابوں کے تحت انہوں نے فلسفہ، مذاہب، تاریخ طبیعیات، عظیم انسانوں کی سوانح حیات اور شاعری سے متعلق اپنی دلچسپی کا ذکر کرتے ہوئے اس کی مصلحت واضح کی ہے۔ ان کی نظر میں کتابوں سے اسرار زندگی کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ فکر کو غذا ملتی ہے اور قوموں اور مختلف ادوار کے تجربات کا علم حاصل ہوتا ہے۔ عقاد ایک موضوع پر کئی کئی کتابیں پڑھنے کے قائل ہیں۔ کیونکہ ہر مصنف کا انداز اور مواد مختلف ہوتا ہے۔ فلسفیانہ، علمی اور ادبی کتابوں کی افادیت بتاتے ہوئے انہوں نے پہلے ادبی پھر فلسفیانہ اور اس کے بعد علمی کتابوں سے اپنی دلچسپی اور پسندیدگی ظاہر کی ہے۔ ان کی نظر میں مفید کتاب وہ ہے جس سے علم اور قوت ادراک میں اضافہ ہو اور زندگی سے بہتر طور پر لطف اندوز ہونے کا جذبہ پیدا ہو۔(۲۸)

اپنی مقالہ نویسی کے بارے میں انہوں نے یہ حقیقت واضح کی کہ ان کے اکثر مقالات اخبار و رسائل کے مدیروں کی تجویز پر لکھے گئے۔(۲۹) موضوعات کا تعین بھی ان کی طرف سے ہوتا تھا۔ اس سے انہیں آسانی بھی ہوتی تھی۔ ان کے لیے کسی موضوع پر لکھنا کوئی دشوار کام نہیں تھا۔ البتہ صحافتی زندگی کے ہنگاموں کی وجہ سے ان مقالات کی تقدیم و تاخیر میں بعض دشواریاں پیش آتی تھیں۔ ان کے مقالات ادبی اور سیاسی نوعیت کے ہوتے تھے۔ مختلف اخبارات میں وہ کتابوں پر

تبصرہ اور کسی یورپی ادیب کا تعارف پیش کرتے تھے۔ مقالات سے ہٹ کر کے کتابوں کے موضوعات کے انتخاب کا ان کا طریقہ کچھ مختلف تھا۔ ان میں وہ بالعموم ان موضوعات کو منتخب کرتے تھے جن کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ان کے متعلق معلومات کم ہیں۔ وہ مناسب وقت کے لیے پسندیدہ موضوعات پر لکھنے کے کام کو موخر کرتے رہتے تھے۔ تاکہ موضوع کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا جاسکے۔ یہی وجہ ہے کہ شدید خواہش کے باجود وہ امام غزالی اور شیخ محمد عبدہ پر جو کچھ لکھنا چاہتے تھے نہیں لکھ سکے۔ وہ شیخ محمد عبدہ پر اپنی مختصر کتاب سے اسی لیے مطمئن نہیں ہیں۔ (۳۰)

''طرز تالیف'' کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ سب سے پہلے وہ موضوع سے متعلق تمام تفصیلات اپنے ذہن میں منطقی ترتیب کے ساتھ یکجا کر لیتے ہیں۔ لکھنے کے لیے انہیں پرسکون مقام چاہیے۔ (۳۱) ان کے زیادہ تر سیاسی مقالات بستر پر لیٹ کر لکھے گئے۔ البتہ اشعار وہ ٹہل کر کہتے تھے۔ مقالات کتابوں کی صورت میں طبع ہونے سے پہلے ان پر ایک نظر ضرور ڈالتے تھے۔ دوران تحریر بھی قطع و برید کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ان کے استدلال کا زیادہ تر انداز یہ ہے کہ وہ مضبوط ترین دلائل سے کمزور دلائل کی طرف آتے ہیں۔ وہ کسی آدمی کی موجودگی میں بہت مشکل سے لکھ پاتے تھے۔ دوران تحریر چائے، سگریٹ یا دوسری نشاط انگیز چیزوں سے وہ احتراز کرتے تھے۔ (۳۲)

''کتابوں کی تالیف کے انداز'' سے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ یہ تقسیم و تنظیم پر مبنی ہے۔ ''تبویب و ترتیب'' والے طرز سے انہیں قدرے اختلاف ہے۔ ان کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ موضوع کے اقسام و اجزاء کا ذہن اور حافظہ میں احاطہ کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد ہر قسم کے ماخذ و مواد کی تلاش پر غور و فکر کرتے ہیں اور ذہن میں معاون کتب کا ایک نقشہ بنا لیتے ہیں۔ (۳۳) اس کے بعد مطالعہ کا کام شروع کرتے ہیں۔ جب کوئی مفید مطلب بات مل جاتی ہے تو اسے حوالوں کے ساتھ نقل کر لیتے ہیں اور اس پر مختصر اشارے میں اپنا موافق یا مخالف تبصرہ بھی نقل کر دیتے ہیں۔ پھر انہیں متعلقہ لفافوں میں رکھ لیتے ہیں اور دوران تحریر ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ اس سے بلاشبہ مراجعت میں آسانی ہوتی ہے۔ اس کے بعد ''تصفیہ و تنظیم'' کا مرحلہ آتا ہے۔ وہ ہر لفافہ کے اندر رکھے ٹکڑوں پر نظر ثانی کر کے غیر ضروری مسائل کو خارج کر دیتے ہیں۔ آخری

مرحلہ میں عنوانات وغیرہ میں بعض تبدیلیاں بھی کرنا پڑتی ہیں۔(۳۴) وہ اپنے مذکورہ نہج کی وضاحت کے لیے اپنی بعض تصنیفات کا حوالہ دیتے اور بعض اعتراضات نقل کرکے ان کا جواب دیتے ہیں۔(۳۵)

"جونہیں لکھا......اور جسے لکھنا چاہیے" کے عناوین کے تحت انہوں نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ ان کی تحریریں مختلف مسائل کے تعلق سے ہیں۔ان پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انہیں ابھی کیا کیا لکھنا ہے؟(۳۶)

چوتھی فصل میں انہوں نے "خود آگہی"، "کامیابی کے لیے اپنے راستہ کا تعین"، "فرصت کے اوقات سے میں نے کیا سیکھا"، "میری زندگی کی سب سے کٹھن گھڑی" اور "میں نوجوانی میں بزرگ تھا" کے عناوین سے پانچ مضامین سپرد قلم کیے۔"خود آگہی" میں لکھا کہ انسان کے لیے اپنے نفس کی مکمل معرفت ممکن نہیں ہے۔البتہ وہ اس کے حدود اور جوانب کی معرفت حاصل کرسکتا ہے۔پھر وہ نفس کی معرفت اور نفس کے حدود کی معرفت کے درمیان فرق واضح کرتے ہیں۔(۳۷) اس کے بعد وہ اپنی بعض صفات مثلاً خوداعتمادی، غور وفکر، گوشہ نشینی، سنجیدگی اور کتب بینی وغیرہ اور بعض ناپسندیدہ افعال جیسے ظلم، شکست وہزیمت اور مصیبت وتکلف کا ذکر کرتے ہیں، اخیر میں لکھتے ہیں:

> "اس طرح نفس کے حدود کا تو مجھے اچھی طرح علم ہے لیکن ان کے متعلقات کو میں بالکل نہیں جانتا، مجھے یقین ہے کہ سقراط نے جب یہ کہا تھا کہ "خود کو پہچانو" تو وہ کاہنوں کی زبان استعمال کرتا تھا۔کیونکہ یہ مطالعہ غیب کی معرفت کا تھا"۔(۳۸)

"راہ کامیابی کا علم" میں وہ بتاتے ہیں کہ ان کی زندگی میں بہت سی خواہشوں نے سر اٹھایا لیکن وہ ان سے دامن بچا کر نکل گئے۔شروع میں انہیں فوج میں ملازمت کرنے کا خیال ہوا۔اس کے بعد زراعت اور حیوانات کی تعلیم حاصل کرنے کی طرف ان کا ذہن مائل ہوا لیکن بعد میں یہ واضح ہوگیا کہ وہ صرف ادب کے لیے پیدا کیے گئے ہیں(۳۹) ادب کے میدان ہی میں انہیں کامیابی ملی۔انہیں مسرت ہے کہ اس کامیابی کے تمام اسباب ان کے لیے فراہم ہوگئے تھے۔ان کے دل میں اس

کی سچی خواہش اور طلب تھی۔ کام کرنے کا بے پناہ جذبہ تھا۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ انہیں اعتماد اور مشکلات ومصائب میں صبر واستقامت کا حوصلہ تھا۔ پھر دوسرے اسباب مثلاً تعلیم، ماحول اور تہذیب وغیرہ بھی فراہم ہوتے گئے اس طرح ان کی کامیابی کی راہ ہموار ہوتی گئی۔ (۴۰)

''فرصت کے اوقات میں میں نے کیا سیکھا'' میں وہ وقت کی قدر وقیمت واضح کرتے ہیں اور پھر مشرقی لوگوں کے لہو ولعب کا ذکر کرکے ان کو ذلت اور پستی کا بنیادی سبب قرار دیتے ہیں۔ وہ چھٹی کے اوقات کو یوں ہی ضائع کرنے کے بجائے یہ مشورہ دیتے ہیں کہ ان کو اپنی منشا کے مطابق استعمال کرنا چاہیے۔ (۴۱) بعض یورپی قوموں کا ذکر کرکے یہ بتاتے ہیں کہ فرصت کے اوقات کو استعمال کرکے کیسی عظیم کامیابیاں حاصل کی گئیں۔ (۴۲) اگر کسی شخص کو اس کی بیکاری کے اوقات میں کسی کمرہ میں بند کردیا جائے اور وہ اس پر صبر کرلے تو وہ شخص یقیناً فکر، اخلاق اور قوت برداشت کا حامل ہوگا۔ ورنہ وہ بیکار اور بے مصرف آدمی ہے، خالی اوقات کا سب سے بہترین مصرف یہ ہے کہ آدمی اپنے تجربات اور کتابوں سے جمع کردہ معلومات کی چھان پھٹک کرے۔ اس کام کی بے حد اہمیت ہے۔ (۴۳)

''میں نوجوانی میں بزرگ تھا'' میں انہوں نے اپنے بچپن اور جوانی کے بعض ایسے واقعات بیان کیے ہیں جن سے اس عمر میں ان کی غیر معمولی سنجیدگی کا اندازہ ہوتا ہے، مثلاً انہوں نے کبھی ہاف پینٹ نہیں پہنا۔ کھیل کود اور ہنسی مذاق میں کبھی حد سے آگے نہیں بڑھے وغیرہ۔ (۴۴) وہ کہتے ہیں کہ اس احتیاط کی وجہ سے ان کی جوانی کا سرمایہ محفوظ رہ گیا اور وہ ساٹھ سال کی عمر تک پہنچنے کے باوجود جوانوں کی طرح بلکہ ان سے زیادہ قوت عمل محسوس کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک جوانی کی بقا اور وجود کا صحیح پیمانہ عمل ہے اور پسندیدہ عمل حصول علم ہے، علم کی خواہش زندگی کے کسی مرحلہ میں ان سے جدا نہیں ہوئی۔ (۴۵) وہ اپنے دوست توفیق الحکیم کے اس قول کی تصدیق کرتے ہیں کہ ''اگر جنت میں انہیں اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کا موقع نہ ملا تو وہاں ان کے لیے قیام کرنا مشکل ہوجائے گا''۔ (۴۶) پھر وہ مطالعہ اور معرفت کا فرق واضح کرتے ہیں طلب معرفت اور اس سے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ساٹھ سال کی عمر میں گرچہ مطالعہ کے اوقات میں کمی آگئی ہے۔ لیکن اس کی بہتر تلافی اس طرح ہوتی ہے کہ

اس عمر میں اخذ واستفادہ میں برکت زیادہ ہوجاتی ہے۔ ''چونکہ ایام جوانی ہی میں بوڑھے ہوگئے تھے۔اس لیے بڑھاپے میں جوانی کا وجود قرین قیاس ہے''۔(۴۷)

پانچویں فصل میں مصنف نے ''میرے دوست اور دشمن''، ''بچے میرے دوست''، ''میں قید خانہ میں'' اور ''صحت و بیماری کے بارے میں کچھ تاثرات'' کے موضوع پر گفتگو کی ہے۔اپنے دوستوں اور دشمنوں کے بارے میں ان کا خیال یہ ہے کہ دونوں کی موجودگی ضروری ہے۔دشمنوں کی مخالفت سے آدمی کو زینت ملتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر حسد، مخالفت اور رشک کے لیے کچھ پہلو موجود ہیں۔(۴۸) لوگوں سے ان کی دوستی یا دشمنی کی بنیاد کوئی ذاتی ضرورت یا انسانی طبیعت کی کمزوری نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ کسی نظریہ، ادبی مقاصد منزل یا ذہنی دلچسپیوں میں اشتراک و عدم اشتراک پر مبنی ہے۔ان کی مخالفت میں سماج کے ہر طبقہ کے لوگ شامل رہے۔لیکن وہ برابر ثابت قدم رہے اور دشمنوں کی تلواریں ان کی زرہوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگئیں۔(۴۹) ان کے پاس کوئی مضبوط خاندانی پس منظر نہیں ہے اور نہ ہی کوئی بڑی علمی سند اور مظاہر و القاب ہیں۔اس کے باوجود وہ ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔وہ خود بھی صرف ٹھوس صلاحیتوں والے اہل علم کی قدر کرتے ہیں اور ان کی دوستی ان سے ہے جو ہر طرح کی ظاہر پرستی سے بیزار ہیں۔(۵۰)

''بچے میرے دوست'' کا خلاصہ یہ ہے کہ بچے گلشن انسانیت کی کلی اور اس کی بہار کی رونق ہیں۔وہ شباب اور حیات کے مبشر ہیں۔بچوں سے انسان بہت کچھ سیکھتا ہے۔ان کا ساتھ ایک خوبصورت ریاضت ہے۔ان سے ایک نئی زندگی حاصل ہوتی ہے اور طبیعت پہلے سے زیادہ بشاش ہوجاتی ہے۔(۵۱)

اس کے بعد وہ ''میں قید خانہ میں'' انہوں نے بتایا کہ ان کا داخل زنداں ہونا اچانک حادثہ نہیں۔حکومت پر تنقیدی خیالات کی وجہ سے انہیں پہلے سے اس کا یقین تھا۔(۵۲) انہیں ۱۲/اکتوبر ۱۹۳۰ء کو گرفتار کیا گیا اور جولائی ۱۹۳۱ء میں رہا کیا گیا۔اس اسیری احوال میں جیل کی کوٹھری، قیدیوں کا شور و غوغا، جیل کے ملازمین، فوجی افسر، جیلر، کھانا، بستر اور یہاں کے بعض ساتھیں کا ذکر ہے۔(۵۳)

چھٹی فصل میں وہ ''میرا ایمان''، اگر میں پھر طالب علم بن جاؤں''، میرا فلسفۂ زندگی''

اور ''کیا یہ زندگی جینے کے لائق ہے؟'' جیسے مضامین میں لکھتے ہیں کہ ایمان وراثت کے ساتھ طویل فکر وجستجو اور گہرے احساس وشعور کا نتیجہ ہے۔ وراثت کے بارے میں انہوں نے اپنے والدین کے تقویٰ اور پابندی صوم وصلوٰۃ کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔(۵۴) باری تعالیٰ نے کائنات کی جو توجیہ وتفسیر کی ہے وہ جدید مادہ پرستوں کی توجیہات سے بہت زیادہ واضح ہے۔ان توجیہات سے عقل ناقابل حل تناقض کا شکار ہوجاتی ہے۔ان کی بجائے خرافات اور اساطیر کی تصدیق آسان نظر آتی ہے۔(۵۵)

عقیدہ کے علاوہ اخلاق، معاملات اور ادب کے بارے میں اپنے ایمان ویقین کی وضاحت میں لکھا کہ عالم اخلاق میں خیر کا سب سے بڑا محرک انسان کے کمال کی طلب اور اس کا فہم ہے اور شر سے روکنے کا سب سے بڑا داعیہ اس کے نفس کا علم ہے۔ بھلائی انسانی طبیعت میں موجود ہے لیکن اس کا سراغ ہر وقت نہیں لگ سکتا۔انسان میں موجود بھلائی کے عنصر سے مایوس نہ ہونا چاہیے۔ادب کے بارے میں ان کا ماننا ہے کہ یہ عقل کا ایک پیغام ہے جسے دوسروں تک پہنچایا جاتا ہے۔ادب دراصل ایک انسانی جوہر ہے اور محض لفاظی پر مبنی نہیں۔ادب کو پڑھ کر قاری کوئی نئی چیز محسوس نہ کرے تو خاموشی بہتر ہے۔(۵۶)

''اگر میں طالب علم بن جاؤں'' کے تحت انہوں نے طالب علموں کی نفسیات میں لکھا کہ کیوں وہ تعلیم سے بھاگتے ہیں۔(۵۷) اپنے بارے میں بتایا کہ وہ ہمیشہ نظام کے پابند طالب علم رہے اور اپنے فرائض سے کبھی غفلت نہیں برتی ''اس لیے اگر دوبارہ طالب علم بننے کا موقع ملے تو وہ اسی روش پر کاربند رہیں گے۔غیر درسی کتب اور سیاسی وادبی مطالعہ کا سلسلہ بھی جاری رہے گا۔زمانہ طالب علمی میں وہ درسی کتابوں میں پیچھے رہ جاتے تھے۔لیکن اس پر کوئی افسوس نہیں'' (۵۸) اور اگر انہیں دوبارہ موقع ملا تو وہ ورزش اور کھیل کود کو حرام اور ممنوع نہیں سمجھیں گے۔کیونکہ اس کے نقصانات واضح ہو چکے ہیں، بہر حال وہ ماضی کی طرف لوٹنا پسند نہیں کرتے کیونکہ ان کی نظر میں ''حال'' ''ماضی'' سے بہتر ہے۔(۵۹)

''میرا فلسفہ محبت'' میں انہوں نے محبت کی مکمل تعریف کی پیچیدگی کا اعتراف کرتے ہوئے منفی اور مثبت تعبیرات بیان کی ہیں۔(۶۰) جو مختلف انسانی تجربات پر مشتمل ہیں۔خلاصۂ کلام یہ ہے کہ:

''محبت کئی جذبوں کا نام ہے کسی ایک کا نہیں اور اسی وجہ سے اس میں قوت وشدت ہوتی

ہے۔اس میں باپ کی شفقت، دوست کی محبت، شب زندہ دار کی بیداری، خواب دیکھنے والے کی حیرانی، صدق ووہم، ایثار وخودغرضی، مشیت ومجبوری، غرور وذلت، بیم ورجا، لذت وعذاب، گناہ وبرأت، انفرادیت وثنویت وجمعیت اور دوام بنی نوع انسان سب چیزیں شامل ہیں''۔(۶۱)

''میرا فلسفہ زندگی'' کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ مادی چیزوں سے بیزار اور بے پرواہ ہیں۔ انہیں مال ودولت وغیرہ میں غیر معمولی دلچسپی لینے والوں پر سخت حیرت اور تعجب ہے، اس کا سبب وہ اپنے موروثی مزاج، لوگوں کے تجربات و واقعات اور درس ومطالعہ کو قرار دیتے ہیں۔(۶۲) اسی لیے وہ تاریخی شخصیات اور فاتحین کو زیادہ پسند نہیں کرتے۔ مال ودولت اور جاہ وحشمت وجہ تعریف نہیں۔(۶۳) لکھتے ہیں:

''تمہاری مال داری و بے نیازی خود تمہاری ذات کے اندر ہے اور تمہاری قیمت تمہارے عمل میں ہے اور تمہارے محرکات تمہارے مقاصد سے زیادہ توجہ کے مستحق ہیں۔لوگوں سے بہت زیادہ توقع قائم نہ رکھو''۔(۶۴)

''کیا یہ زندگی جینے کے لائق ہے''؟ میں لکھتے ہیں کہ درحقیقت زندگی کی حرص اور تمنا کوئی معیوب چیز نہیں ہے زندگی کی حفاظت اس وقت ضروری ہے جب وہ ہماری شرائط کے مطابق ہو۔(۶۵)

ساتویں فصل میں تین چھوٹے چھوٹے مضامین ''میں نے اپنی جگہ سے پوری دنیا کی سیاحت کرلی''، ''میرے سب سے بہترین دن'' اور ''گرمی ناپسند ہے'' ہیں، پہلے مضمون میں سیاحت کی قسموں اور فائدوں میں بتایا کہ انہوں نے بغیر سفر کیے بڑی سیاحتیں کرلیں۔اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے وہ چیزیں دیکھ لی ہیں جنہیں سیاح سفر کر کے دیکھتے ہیں۔(۶۶)

''میرا سب سے بہتر دن'' میں سب پہلے حسن وجمال کے معنی اور مفہوم پر ایک فلسفیانہ بحث میں خوبصورت دن کے بہت سے تصورات اور امکانات واضح کیے۔ان کی نظر میں خوبصورت دن کیا ہیں، ملاحظہ ہو:

''خوبصورت دن وہ ہے جس میں ہم اپنی دنیا کے مالک ہوں اور دنیا ہماری مالک نہ ہو۔ اس میں ہم اپنی لذت وشہوت پر قابو رکھیں اور اس کے ہاتھوں مجبور و بے بس نہ بنیں''۔(۶۷)

''زندگی کا سب سے خوبصورت دن وہ ہے جس میں تمہیں اپنے نفس پر غلبہ کے بعد یہ احساس ہو کہ تم ایسی ثروت کے مالک بن گئے ہو جس کے سامنے مال، لذت اور تعریف کی کوئی قیمت نہیں''۔(۶۸)

''گرمی مجھے ناپسند ہے'' میں لکھا کہ انسان اگر کسی موسم سے اکتاہٹ محسوس کرتا ہے یا کسی دوسرے موسم کی آمد کا مشتاق ہو تو وہ قابل ملامت نہیں ہے اور نہ ہی ناشکرا ہے۔

آٹھویں فصل میں ''چالیس کے بعد''،''پچاس کے اشارے''،''ساٹھ کے اشارے''، ستر کے اشارے'' اور میرے اعتراضات'' کے عنوانوں سے دلچسپ تحریریں ہیں جن میں مصنف نے اپنی نفسیاتی اور فکری حالت، جوانی، ادھیڑپن اور بڑھاپے نیز بیس، چالیس، پچاس، ساٹھ اور ستر کی منزلوں میں ذاتی تجربات کا تذکرہ کیا ہے۔ عام نوجوانوں کے علی الرغم وہ اپنی جوانی میں خیالات کے بالمقابل واقعات کی طرف زیادہ مائل تھے۔''وحی الخمسین'' میں انہوں نے اپنی اور اپنے ہم عمروں کی زندگی کا نفسیاتی جائزہ لیا ہے۔ اسی طرح بیس، تیس اور چالیس سال والوں کی ذہنی ونفسیاتی تشریح بھی کی ہے۔(۶۹)''وحی الستین'' میں عمر کے تیزی سے گذر جانے اور اس کا احساس نہ ہونے پر روشنی ڈالی ہے کہ اس عمر میں گرچہ لکھنے پڑھنے کی قوت میں کمی واقع ہوتی ہے لیکن اس کمی کی تلافی تحریر کی مشق ومہارت اور تجربات کی کثرت سے بآسانی ہوجاتی ہے۔ اس عمر میں اپنے پسندیدہ نظریات کے بارے میں جوش وخروش بڑھ جاتا ہے اور معیار جمال بھی اونچا ہوجاتا ہے۔(۷۰)''وحی السبعین'' میں انہوں نے جوانی اور بڑھاپے کے فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھا کہ جوانی کی خرابیوں کے باوجود اس کی ہمیشہ تمنا کی جاتی ہے۔ ستر سال کے بعد اپنی قلبی کیفیات یہ ہوتی ہیں، زندگی کی تمنا نہیں رہ جاتی بلکہ ستر کی عمر میں تو تمنا کا لفظ ہی برا اور بے معنی محسوس ہوتا ہے۔(۷۱) فصل کا آخری مضمون میرے اعترافات کے عنوان سے ہے۔ اعتراف کی تاریخ، اس کا مفہوم اور اس کی غرض وغایت کیا ہے اور یہ تصور اعتراف صرف گناہوں، خطاؤں اور پوشیدہ جرائم کا ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے اندر جو کمیاں اور کوتاہیاں ہیں وہ بالعموم دوسرے انسانوں میں بھی پائی جاتی ہیں لیکن ان کی خوبیوں اور اوصاف میں ان کی برابری اور ہمسری کا کوئی شخص دعوی نہیں کرسکتا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے اوصاف مثلاً عزلت پسندی عزم وارادہ، نفس

پر مکمل کنٹرول، سامان عیش وعشرت سے بے رغبتی وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔خاص بات یہ ہے کہ اس میں کمزوریوں کا تذکرہ بہت ہی مختصر اور سرسری انداز میں کیا گیا ہے۔(۷۲)

نویں فصل میں ''میری لائبریری''، ''کتابوں کے درمیان'' اور ''اپنے گھر میں'' کے عناوین سے تین تحریریں ہیں۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی ''اپنی لائبریری'' کتابوں اور گھر کے متعلق تفصیلات پیش کی ہوں گی لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بلکہ ان میں ان کے ذہن یا ان کے مفروضہ ساتھی یا ہم زاد کے ذہن میں ابھرنے والے بعض سوالات اور اشکالات پر بحث کی گئی ہے۔ جیسے لائبریری کے ضمن میں روشنی، مادہ، روح، شاعری، افسانہ نویسی اور ناول نگاری وغیرہ پر گفتگو ہے۔(۷۳) یہی حال اس کے بعد کے دونوں مضامین کا ہے(۷۴) جو ان کی فکر کے مختلف گوشے نمایاں کرتے ہیں۔خاص بات یہ ہے کہ ان میں دوسرے مضامین کے بالمقابل فنی عناصر مثلاً تصویر، تخیل، خودکلامی کی موجودگی زیادہ نمایاں ہے۔ جس سے مصنف کی فکری، ادبی اور روحانی زندگی کی ایک سچی تصویر بھی سامنے آجاتی ہے۔

ایک تجزیاتی نظر: عقاد کی اس خودنوشت سوانح عمری کے مطالعہ سے ان کی ذاتی زندگی کے بعض پہلو ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ اس میں ان کی خصوصیتیں، خانگی وفکری تربیت، اغراض ومقاصد، ماحول اور اساتذہ وغیرہ کا ذکر ہے تو ایمان وعقیدہ اور ان اصول وضوابط کا بیان بھی آگیا ہے، جس کے اثرات ان کی طبیعت اور مزاج پر مرتب ہوئے۔ یعنی مصنف نے اس میں اپنا جائزہ ایک انسان کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور یہ انسان وہ ہے جسے عقاد خود جانتے ہیں۔ وہ انسان نہیں جسے لوگ جانتے ہیں۔(۷۵) عقاد کی زندگی کے اور بھی بہت سے پہلو ہیں جن کے بارے میں ایک قاری واقف ہونے کی خواہش رکھتا ہے۔ مثلاً عقاد بحیثیت انشاء پرداز، شاعر، سیاست داں، صحافی، فنکار، مورخ، سیرت نگار اور فلسفی وغیرہ لیکن واقعہ یہ ہے کہ کتاب ان تمام گوشوں پر روشنی ڈالنے میں مکمل کامیاب نہیں ہوسکی ہے۔(۷۶) اس کی وجہ غالباً ان کی ہمہ جہت اور ہمہ گیر شخصیت ہے، جس کا ایک کتاب میں احاطہ کرنا مشکل کام ہے۔

بہر حال یہ سوانح دوسرے مفکرین، ادباء اور علماء کی سوانح سے مختلف ہے۔ بعض سوانح تاریخی انداز میں ہیں۔ بعض نے ڈائری اور یادداشت کا انداز اختیار کیا ہے اور بعض لوگوں نے اپنی زندگی کی تصویر اعترافات کے انداز میں پیش کی اور صرف انتہائی اہم واقعات کا تذکرہ کیا ہے لیکن عقاد کی تحریر سوانح نگاری

کے باب میں یقیناً اس پر ایک نئے رنگ و آہنگ کی حامل ہے۔ اس میں صرف شخصیت یا گزرے ہوئے حوادث کا بیان نہیں ہے بلکہ یہ ایک جستجو پسند عالم اور باکمال فنکار کی تحریر ہے، جسے علمی، فکری اور فنی مسائل میں غور وفکر کی عادت ہے اور جس کی جولان گاہ فلسفہ، علم النفس، ادب، تربیت اور عمرانیات کے میدان ہیں۔ جسے زندگی کا وسیع تجربہ ہے اور جس میں ایک عالم کا تجربہ، مفکر کی عبرت پذیری اور فلسفہ کی حکمت شامل ہے۔ انہوں نے مختلف قسم کے علوم اور گوناگوں فکری مسائل پر نظر کی ہے اور ہر واقعہ پر علمی انداز میں تبصرہ کیا یا اس کی نفسیاتی یا فلسفیانہ توجیہ کی ہے۔ وہ ہر بات کی تحقیق و تصدیق کی پوری کوشش کرتے ہیں، تفسیر و تعلیل سے وہ بالکل نہیں گھبراتے۔ وہ فکری اور علمی ماحول کو پسند کرتے ہیں۔ خواہ یہ کتنا ہی بے کیف اور خشک ہو۔ اس لیے انہوں نے اپنے فکری اور عقلی خیالات کی وضاحت کے لیے منطق و فلسفہ کے اصولوں سے بیش از بیش فائدہ اٹھایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب خودنوشت کے حدود سے پرے ہے کیونکہ اس میں احساس و شعور، جذبات اور آسان الفاظ کا خیال بہت کم رکھا گیا ہے۔ وہ بہر حال اپنی عقلیت پسندی سے اپنے آپ کو علاحدہ نہیں کر سکے۔ یہ طبیعت ہی دراصل ان کا نثری سرمایہ ہے۔

ان کی خودنوشت زیادہ تر ان کی اپنی ذات کے اردگرد گھومتی ہے لیکن بیان میں انہوں نے اپنی ذات سے بہت کم تجاوز کیا ہے۔ ان کی منفرد شخصیت ہی ان کی پوری خودنوشت کا بنیادی محور ہے۔ وہ اپنے مخصوص نقطۂ نظر ہی سے تمام واقعات و حادثات کا جائزہ لیتے ہیں۔ چنانچہ یہ بات بہت آسانی سے کہی جاسکتی ہے کہ ان کی ''انا'' ان کے پاس ہمیشہ موجود رہی اور ان سے کبھی جدا نہیں ہوئی۔ اس کے اظہار اور اثبات میں اکثر و بیشتر بات تعلّی اور خود پرستی تک پہنچ جاتی ہے۔ جس سے ان کو معرکوں اور مقابلوں میں شریک ہونا پڑا اور لوگوں سے عداوتیں مول لینی پڑیں۔ خود پرستی اور تعلّی کا یہ وصف ان کی سوانح کے علاوہ ان کے اشعار میں بھی ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ خود پسندی کا یہ وصف ان کے اندر بچپن سے موجود تھا۔ اپنی خودنوشت میں انہوں نے کئی ایسے واقعات نقل کیے ہیں جن سے ان کے ضدی، باغیانہ اور خود پسندانہ مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔ خود بینی، گوشہ نشینی اور علاحدگی پسندی تو انہیں موروثی طور سے ملی تھی۔ بعد میں ڈارون اور نٹشے وغیرہ کے مطالعہ سے ان عناصر کی بالیدگی اور نشو ونما میں مدد ملی، یہ عناصر ان کی شخصیت میں اس طرح جاگزیں ہوئے کہ یہی امتیازی شان بن گئے۔ (۷۷)

عقاد نے عظمت اور برتری کے جس احساس کا بار بار مظاہرہ کیا ہے۔ اس میں وہ ایک

حدتک حق بجانب ہیں، انہوں نے بلاشبہ ایک کامیاب اور شاندار زندگی گذاری، علم وثقافت کی راہ میں حائل بہت سی مشکلات کو دور کر کے انہوں نے ادب، سیاست، معاشرت اور فکر کی دنیا میں اپنے لیے ایک نمایاں اور ممتاز مقام بنایا (۷۸) اور روایتی تعلیم سے بہت زیادہ مستفید نہ ہونے کے باوجود وہ محض اپنی محنت، لگن اور دلچسپی سے مفکرین کی صف اول میں شامل ہوگئے۔ وہ عصر حاضر کے ان چند رہنماؤں میں سے ایک ہیں جو مشرق کے علاوہ مغربی تہذیب کے اسرار ورموز سے بھی واقف تھے اور اپنی تحریروں کے ذریعہ انہوں نے اس تہذیب کے بعض مفید پہلوؤں سے ہم وطنوں کو روشناس بھی کرایا۔ اس سے مصر اور عالم عرب میں ادبی وفکری نشاۃ ثانیہ کے آغاز میں کافی مدد ملی۔ (۷۹) جدید عربی شاعری خاص طور سے ان کی مساعی اور کوششوں کی مرہون منت ہے، جس میں روایت پرستی اور تقلید کے خلاف ان کی آواز کو پذیرائی اور مقبولیت ملی۔

عقاد نے ہمیشہ ظلم وجبر اور سرمایہ داری واستعمار کے خلاف جنگ کی۔ وہ معیشت، معاشرت، سیاست اور فکر میں آزادی کے علم بردار تھے۔ وہ بے باک، نڈر اور پختہ مشق ادیب، صحافی اور نقاد تھے۔ اس لیے ان کی ہر طبقۂ فکر میں پذیرائی ہوئی۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے جدید عصری تقاضوں سے بھرپور اور ہم آہنگ قرار دیا اور یہ مطالبہ کیا کہ تمام عرب شعراء اور ادباء کو اپنی قیادت کا علم عقاد کے ہاتھ میں دے دینا چاہیے۔ (۸۰) ابراہیم عبدالقادر مازنی نے ان کے قصیدہ ''ترجمہ شیطان'' کو عربی زبان کا پہلا قصیدہ قرار دیا جو متعین فکر کے تحت پیش کیا گیا ہے۔ سعد زغلول کی نظر میں وہ ایک ایسے ادیب ہیں جس کے پاس قلم کی دولت، مردانگی، سچی وطن دوستی اور وسیع معلومات کا ذخیرہ موجود ہے۔ (۸۱)

تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اپنی خوبیوں کو گنانے میں عقاد نے ضرورت سے زیادہ زور صرف کیا جس سے ان کی خودنوشت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ ایک کامیاب خودنوشت سوانح نگار اپنے آپ کو ہمیشہ احتساب، مواخذہ اور تادیب کی میزان پر رکھتا ہے۔ خامیوں اور عیوب پر بھی نظر ہوتی ہے، جس سے قارئین کے ذہن وفکر پر سچے نقوش ثبت ہوتے ہیں اور صداقت، معروضیت اور غیر جانب داری خود اپنی گواہی دیتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عقاد سے یہاں چوک ہوئی ہے۔

فنی لحاظ سے مصنف نے اس میں وہی تحلیلی اسلوب اختیار کیا ہے جو ان کی تحریر کا خاصہ ہے وہ مقالہ نگاری کے ماہر تھے اور اس کے اسلوب یعنی تحلیل و تجزیہ کے استعمال کی بہترین

صلاحیت رکھتے تھے۔(۸۲) منطقی اور فلسفیانہ طرز نگارش ان کی خودنوشت کا نمایاں پہلو ہے۔

لیکن اس کی وجہ سے فنی طور پر ان کی خودنوشت میں بعض ضروری اوصاف اور عناصر نظر انداز ہوگئے۔ابتدائی ابواب میں کسی حد تک زمانی ترتیب اور منطقی تسلسل کا وجود ملتا ہے لیکن بعد میں اس کی کمی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔جس سے ان کی ذہنی ،فکری ،ادبی اور نفسیاتی زندگی کے ارتقائی مراحل سے واقفیت میں دشواری پیش آتی ہے۔گرچہ انہوں نے اپنی عقلی ،اخلاقی اور نفسیاتی زندگی کی صورت گری میں تدریج کا خیال رکھا ہے لیکن واقعات میں جوزمانی ترتیب ملحوظ رکھنی چاہیے تھی اس کا فقدان ہے۔وہ اپنے افکار ومعانی اور احساسات وخواطر کو آزادانہ طور سے پیش کرنے میں اپنی قوت یادداشت پر انحصار کرتے ہیں۔اس کی وجہ سے تکرار کی بدنمائی بھی آگئی ہے، تدریج اور تسلسل کی کمی کی وجہ سے قارئین کو جگہ جگہ بے ربطی اور خلا اور انتشار کا احساس ہوتا ہے۔

اس خودنوشت کی ادبی حیثیت کو نقصان ان کے سلسلۂ عبقریات سے بھی ہوا۔(۸۳) غالباً ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ وہ تاریخ کی مایہ ناز ہستیوں کی طرح ایک اور ہستی کی سوانح قلم بند کررہے ہیں۔اس تصور کی وجہ سے انہوں نے صرف اپنی خوبیوں پر توجہ دی جس سے منفی پہلوؤں کے لیے کوئی جگہ نہیں رہ گئی۔اس کی وجہ سے مصنف کی صاف گوئی ،سچائی اور غیر جانب داری کے تعلق سے شکوک وشبہات پیدا ہوئے کیونکہ انسان خطا ونسیان سے مرکب ہے۔اگر وہ اپنے اس طبعی وصف کو نظر انداز کرے گا تو بجا طور پر اس کی گرفت ہوگی۔اس وجہ سے فنی حیثیت سے یہ خودنوشت عربی ادب میں وہ مقام نہیں حاصل کرسکی جس کی وہ مستحق تھی۔

اس آپ بیتی کی ایک اور کمزوری یہ ہے کہ اس میں صرف خارجی افکار ومسائل سے تعرض کیا گیا ہے۔واردات قلب کی کیفیتیں اس میں بہت کم ہیں۔مصنف نے ایک سرگرم ادبی وتنقیدی زندگی بسر کی ،مختلف مباحث اور مسائل میں حصہ لیا، جس سے لازماً ان کے دل میں ہلچل اور بے چینی پیدا ہوئی ہوگی لیکن وہ کمال ہوشیاری سے ان کیفیات سے اپنے آپ کو الگ کرلیتے ہیں۔ممکن ہے کہ اپنے سخت اور بے لچک مزاج کی وجہ سے انہوں نے ایسا قصداً کیا ہو، کیونکہ اس شکل میں ان کی زندگی کے بعض ایسے گوشے بھی سامنے آسکتے تھے جو ان کی تعلی پسند اور مغرور شخصیت سے میل نہ کھاتے ہوں۔

اس جائزے سے یہ حقیقت واضح ہوگئی ہے کہ عقاد کی خودنوشت سوانح حیات عقلی اور فکری

اعتبار سے عربی زبان کے ذخیرے میں ایک ممتاز مقام کی گرچہ حامل ہے اور یہ عقاد کی منطقی اور فلسفیانہ شخصیت کی بھرپور عکاس ہے لیکن یہ پہلو اس قدر غالب ہے کہ ادب اور فن کے بہت سے تقاضے نظر انداز ہوگئے۔اس میں افکار کے تحلیل وتجزیہ اور اپنی ذات کی فلسفیانہ وعقلی تعبیر پر اس قدر زور ہے کہ اس کے باعث وہ عناصر کمزور پڑگئے ہیں جو ہماری جمالیاتی حس کو بیدار کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

حوالہ جات

(۱) عباس محمود العقاد، أنا، دارالہلال قاہرہ (ب ت)۔ (۲) ایضاً، ص ۵-۷ (مقدمہ)۔ (۳) ایضاً، ص ۸۔ (۴) ایضاً، ص ۲۷۔ (۵) عباس محمود العقاد، انا، ص ۱۔ (۶) ایضاً، ص ۳۰۔ (۷) ایضاً، ص ۳۱۔ (۸) ایضاً، ص ۳۲-۳۳۔ (۹) ایضاً، ص ۳۴۔ (۱۰) ایضاً، ص ۳۴۔ (۱۱) ایضاً، ص ۴۲-۴۴۔ (۱۲) ایضاً، ص ۴۳۔ (۱۳) ایضاً، ص ۴۵۔ (۱۴) ایضاً، ص ۴۶-۴۷۔ (۱۵) ایضاً، ص ۴۸۔ (۱۶) ایضاً، ص ۴۹-۵۰۔ (۱۷) ایضاً، ص ۵۱۔ (۱۸) ایضاً، ص ۵۲-۵۶۔ (۱۹) ایضاً، ص ۵۷۔ (۲۰) ایضاً، ص ۶۶-۶۸۔ (۲۱) ایضاً، ص ۶۹۔ (۲۲) ایضاً، ص ۷۰۔ (۲۳) ایضاً، ص ۷۰-۷۴۔ (۲۴) ایضاً، ص ۷۲۔ (۲۵) ایضاً، ص ۷۶-۷۹۔ (۲۶) ایضاً، ص ۸۰-۸۳۔ (۲۷) ایضاً، ص ۸۴-۸۵۔ (۲۸) ایضاً، ص ۸۸-۹۰۔ (۲۹) ایضاً، ص ۹۱۔ (۳۰) ایضاً، ص ۹۱-۹۵۔ (۳۱) ایضاً، ص ۹۵۔ (۳۲) ایضاً، ص ۹۶۔ (۳۳) ایضاً، ص ۶۷۔ (۳۴) ایضاً، ص ۹۹-۱۰۰۔ (۳۵) ایضاً، ص ۱۰۰-۱۰۱۔ (۳۶) ایضاً، ص ۱۰۳۔ (۳۷) ایضاً، ص ۱۰۴-۱۰۶۔ (۳۸) ایضاً، ص ۱۱۱۔ (۳۹) ایضاً، ص ۱۱۲۔ (۴۰) ایضاً، ص ۱۱۳۔ (۴۱) ایضاً، ص ۱۱۶-۱۱۷۔ (۴۲) ایضاً، ص ۱۱۷۔ (۴۳) ایضاً، ص ۱۱۸-۱۲۰۔ (۴۴) ایضاً، ص ۱۲۲-۱۲۳۔ (۴۵) ایضاً، ص ۱۲۳-۱۲۴۔ (۴۶) ایضاً، ص ۱۲۵۔ (۴۷) ایضاً، ص ۱۲۶۔ (۴۸) ایضاً، ص ۱۲۷-۱۲۸۔ (۴۹) ایضاً، ص ۱۲۸-۱۳۰۔ (۵۰) ایضاً، ص ۱۳۱-۱۳۲۔ (۵۱) ایضاً، ص ۱۳۳-۱۳۶۔ (۵۲) ایضاً، ص ۱۳۷-۱۳۹۔ (۵۳) ایضاً، ص ۱۴۶-۱۵۱۔ (۵۴) ایضاً، ص ۱۵۲-۱۵۳۔ (۵۵) ایضاً، ص ۱۵۴-۱۵۶۔ (۵۶) ایضاً، ص ۱۵۵-۱۵۶۔ (۵۷) ایضاً، ص ۱۵۷۔ (۵۸) ایضاً، ص ۱۵۹۔ (۵۹) ایضاً، ص ۱۶۱۔ (۶۰) ایضاً، ص ۱۶۲-۱۶۴۔ (۶۱) ایضاً، ص ۱۶۴-۱۶۵۔ (۶۲) ایضاً، ص ۱۶۸۔ (۶۳) ایضاً، ص ۱۶۹-۱۷۱۔ (۶۴) ایضاً، ص ۱۷۱۔ (۶۵) ایضاً، ص ۱۷۲-۱۷۵۔ (۶۶) ایضاً، ص ۱۷۶-۱۷۷۔ (۶۷) ایضاً، ص ۱۷۸۔ (۶۸) ایضاً، ص ۱۷۸-۱۷۹۔ (۶۹) ایضاً، ص ۱۸۷-۱۹۳۔ (۷۰) ایضاً، ص ۱۹۴-۱۹۸۔ (۷۱) ایضاً، ص ۱۹۷-۲۰۳۔ (۷۲) ایضاً، ص ۲۰۴-۲۰۸۔ (۷۳) ایضاً، ص ۲۰۹-۲۱۳۔ (۷۴) ایضاً، ص ۲۱۴-۲۳۴، ص ۲۳۵-۲۷۳۔ (۷۵) ایضاً، ص ۲۰-۲۱۔ (۷۶) ایضاً، ص ۸۔ (۷۷) ایضاً، ص ۱۲ و ۳۹-۴۰۔ (۷۸) شوقی ضیف، مع العقاد، دارالمعارف مصر، ۱۹۶۴ء، ص ۵۴-۵۵۔ (۷۹) حیاۃ قلم، مقدمۃ طاہر الطناجی، ص ۱۵۔ (۸۰) عقاد دراسۃ وتحیۃ، خلیفۃ التونسی، مکتبۃ الانجلو المصریۃ (ب ت)، ص ۱۴۰۔ (۸۱) محمد طاہر الجبلاوی، فی صحبۃ العقاد، مکتبۃ الانجلو المصریۃ (ب ت)، ص ۱۹۶-۱۹۷/۲۰۳۔ (۸۲) عثمان امین، نظرات فی فکر العقاد، الدار المصریۃ للتالیف والترجمۃ ۱۹۶۶ء، ص ۴۹/۵۰۔ (۸۳) عبقریات کے لیے ملاحظہ ہو: شوقی ضیف، مع العقاد، ص ۸۴-۹۰۔

نبی کریم ﷺ کی عائلی زندگی
مسیحی اعتراضات کا جائزہ

ڈاکٹر محمد طیب

مسیحی علماء نے نبی کریم ﷺ کی عائلی حیات طیبہ کے متعلق درج ذیل امور پر زیادہ بحث کی ہے: ۱-تعدد ازدواج۔ ۲-سیدہ زینبؓ سے نکاح مبارک۔

اگرچہ عائلی زندگی کے متعلق جزوی طور پر کئی اور باتیں بطور اعتراض بیان کی گئی ہیں مگر مذکورہ بالا چونکہ دو بنیادی اشکالات ہیں لہذا ان کے متعلق قدرے تفصیلی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

تعدد ازدواج کے متعلق اعتراضات: اسلام کے قانون تعدد ازدواج اور نبی کریم ﷺ کی شادیوں پر مسیحی مصنفین کئی اعتراضات کرتے ہیں۔ یہ اعتراضات عموماً مناظرانہ بلکہ مفسدانہ انداز میں ہوتے ہیں۔ ذیل میں ہم ان کے اعتراضات کا طریق استدلال دیکھ سکتے ہیں:

> ”اسلام نے کثرت ازدواج کو جو غیر مہذب یا نیم مہذب و سخت دل قوموں میں سوسائٹی کی ضروریات سے متصور ہو چکی تھی اور جس کا فائدہ اہل مقدرت اپنی عیاشی کے وسائل کی وسعت کے موافق بآسانی اٹھاتے تھے، نہ صرف بے عیب بتلا کر روا رکھا بلکہ شارع اسلام ﷺ اور صحابہؓ نے اپنے عمل و سنت سے اس کو تقدیس عطا کر دی۔ مگر پھر بھی یہ انسانیت، اصول شائستگی اور فلاح قومی و خاندانی کے اس قدر خلاف ہے کہ تہذیب کی ترقی خود مسدود کرتی جاتی ہے“۔(۱)

اسی طرح منٹگمری واٹ مدینہ منورہ میں تعدد ازدواج کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ”یہ خود حضرت محمد ﷺ کے ذہن کی پیداوار ہے“۔(۲)

لکچرر اسلامک اسٹڈیز، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد، پاکستان۔

تعدداز دواج اور سیرت رسول ﷺ: مسیحی علماء کے یہ اعتراضات الہامی تعلیمات سے چشم پوشی بلکہ انکار کی وجہ سے ہیں۔ یہ لوگ کسی شرعی ضابطے اور الہامی تعلیم کو خاطر میں لائے بغیر امام الانبیا ﷺ کی شادیوں پر اعتراض کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو یہ حق دیا کہ آپ ﷺ چار سے زیادہ شادیاں کرسکتے ہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ کی ازواج کی تعداد پر اعتراض غیر قانونی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ اللَّاتِي آتَيْتَ أُجُورَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ وَبَنَاتِ عَمِّكَ وَبَنَاتِ عَمَّاتِكَ وَبَنَاتِ خَالِكَ وَبَنَاتِ خَالَاتِكَ اللَّاتِي هَاجَرْنَ مَعَكَ وَامْرَأَةً مُؤْمِنَةً إِنْ وَهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ إِنْ أَرَادَ النَّبِيُّ أَنْ يَسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لَكَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِي أَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُونَ عَلَيْكَ حَرَجٌ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا۔ (۳)

اے نبی! ہم نے تیرے لیے وہ بیویاں حلال کر دی ہیں جنھیں تو ان کے مہر دے چکا ہے اور وہ لونڈیاں بھی جو اللہ نے تجھے غنیمت میں دی ہیں اور تیرے چچا کی لڑکیاں اور پھوپھیوں کی بیٹیاں اور تیرے ماموں کی بیٹیاں اور تیری خالاؤں کی بیٹیاں بھی جنھوں نے تیرے ساتھ ہجرت کی ہے اور وہ باایمان عورت جو اپنا نفس نبی کو ہبہ کردے۔ یہ اس صورت میں کہ خود نبی بھی اس سے نکاح کرنا چاہے، یہ خاص طور پر تیرے لیے ہی ہے اور مومنوں کے لیے نہیں، ہم کو معلوم ہے کہ عام مومنوں پر ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے بارے میں ہم نے کیا حدود عائد کیے ہیں۔ (تمھیں ان حدود سے اس لیے مستثنیٰ کیا ہے) تاکہ تمہارے اوپر کوئی تنگی نہ رہے اور اللہ غفور ورحیم ہے۔

اس آیت کریمہ سے نبی کریم ﷺ کے ایک سے زیادہ نکاح کرنے کی ضرورت و اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ آپ ﷺ نے اذنِ الٰہی سے نکاح کیے اور دینی مصلحت وضرورت کے تحت کیے۔ آپ ﷺ نے جوانی کی عمر ایک ہی بیوی سیدہ خدیجہؓ کے ساتھ گزاری۔ آخری عمر میں آپ ﷺ نے جو نکاح کیے وہ صرف حکمت الٰہی اور دینی مصلحت کے تحت ہی کیے تھے۔ چنانچہ

سید مودودی لکھتے ہیں:

> ''اب آخر کون صاحب عقل اور ایمان دار آدمی یہ تصور کر سکتا ہے کہ ۵۳ سال کی عمر گزر جانے کے بعد یکا یک حضور ﷺ کی خواہشات نفسانی بڑھتی چلی گئیں اور آپ ﷺ کو زیادہ سے زیادہ بیویوں کی ضرورت پیش آنے لگی۔ دراصل ''تنگی نہ رہے'' کا مطلب سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی ایک طرف تو اس کارعظیم کو نگاہ میں رکھے جس کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے اوپر ڈال دی تھی اور دوسری طرف ان حالات کو سمجھے جن میں یہ کارعظیم انجام دینے کے لیے آپ کو مامور کیا گیا تھا۔ تعصب سے ذہن کو پاک کر کے جو شخص بھی ان دونوں حقیقتوں کو سمجھ لے گا وہ بخوبی جان لے گا کہ بیوی کے معاملے میں آپ ﷺ کو کھلی اجازت دینا کیوں ضروری تھا اور چار کی قید میں آپ ﷺ کے لیے کیا ''تنگی'' تھی''۔ (۴)

تعدد ازدواج پر اعتراض کے بنیادی دو ہی پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک شرعی، دوسرا تاریخی، شرعی پہلو کی صراحت تو قرآن مجید نے کردی اور اس میں کوئی اختلاف و اعتراض کی گنجائش نہیں ہے۔ اب تاریخ انبیاءؑ سے تعدد ازدواج کا مطالعہ ضروری معلوم ہوتا ہے تا کہ یہود و نصاریٰ کے اعتراض کی مزید حقیقت کھل کر سامنے آجائے۔

ازواج انبیاءؑ اور بائبل: بائبل میں انبیاءؑ کی ایک سے زیادہ بیویوں کا تذکرہ موجود ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی تین بیویاں تھیں۔ حضرت یعقوبؑ کی چار بیویاں تھیں، حضرت موسیٰؑ کی بھی چار بیویاں تھیں۔ (۵) قاضی سلیمان منصور پوری نے تورات کے حوالہ سے ان انبیاءؑ کی بیویوں کے نام بھی لکھے ہیں۔ (۶)

حضرت موسیٰؑ کے لیے غیر معین شادیوں کی اجازت: حضرت موسیٰؑ کو یہ حکم دیا گیا کہ جب تو اپنے دشمنوں سے جنگ کرنے کو نکلے اور خداوند تیرا خدا ان کو تیرے ہاتھ میں کر دے اور تو ان کو اسیر کر لائے اور ان اسیروں میں کسی خوب صورت عورت کو دیکھ کر تو اس پر فریفتہ ہو جائے اور اس کو بیاہ لینا چاہے تو تو اسے اپنے گھر میں لے آنا۔ (۷)

حضرت موسیٰ کے لیے اس اذن الٰہی کو مانتے ہوئے حضرت محمد ﷺ کی شادیوں پر اعتراض کس قانون اور ضابطے کے مطابق کیا جاتا ہے؟۔

حضرت سلیمانؑ کی بیویاں اوران کی بت پرستی: حضرت سلیمانؑ کی بیویوں کا تذکرہ بائبل میں ان الفاظ میں ہے:

> ''سلیمان ان ہی کے عشق کا دم بھرنے لگا اور اس کے پاس سات سو شہزادیاں اس کی بیویاں اور تین سو حرمیں تھیں اور اس کی بیویوں نے اس کے دل کو پھیر دیا تھا کیونکہ جب سلیمان بڈھا ہو گیا تو اس کی بیویوں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کر لیا اور اس کا دل خداوند اپنے خدا کے ساتھ کامل نہ رہا جیسا اس کے باپ داؤد کا دل تھا''۔(۸)

بائبل اللہ تعالیٰ کے نبی کے متعلق کیسی کیسی الزام تراشیاں کر رہی ہے کہ وہ بیویوں کی وجہ سے بت پرستی میں لگ گئے۔اس سے بائبل کی صحت کے ساتھ ساتھ عصری حاملین بائبل کی صحت ایمانی کی کیفیت، حالت اور حیثیت بالکل عیاں ہوتی ہے اور یہ حقیقت روز روشن کی طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ اہل کتاب کھلی گمراہی میں ہیں۔

سیدہ زینب بنت جحشؓ سے نکاح کے متعلق الزامات: اس نکاح سعید پر پادری کئی اعتراضات کرتے ہیں۔چنانچہ پادری احمد شاہ الزام لگاتا ہے کہ حضرت زید کے طلاق دینے کی وجہ زینب کا کوئی قصور نہ تھا بلکہ جو قصور تھا وہ حضرت (محمد ﷺ) کا تھا۔''اس سے عشق لگایا تھا''۔(۵۹) وہ مزید اتہام والزام تراشی کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''زینب کو پورا یقین ہو گیا تھا کہ حضرت محمد مجھ پر فریفتہ ہو گئے ہیں اور زید کو بھی پوری طرح معلوم ہو گیا تھا کہ اصل واقعہ یہ ہے۔اس لیے اس نے اپنی جورو کو طلاق دے دیا کہ محمد (صلعم) کا دل ٹھنڈا ہو''۔(۹)

اسی طرح ولیم میور سیدہ زینبؓ سے نکاح پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> "The marrige cause no small obloquy and to save his reputation Mohammad fell back upon his oracle."

اس شادی سے انہیں (محمد ﷺ) بہت زیادہ بدنامی کا سامنا کرنا پڑا اور اپنی شہرت بچانے کے لیے انہوں نے وحی کا سہارا لیا۔ (۱۰)

پادری ٹھاکر داس لکھتا ہے کہ اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے اپنے تئیں اللہ کے حکم سے بے بس بتلا دیا۔ (۱۱) سیدہ زینب سے نکاح کو پادری مذکور گناہ قرار دیتا ہے (۱۲) اور زہر افشانی کرتے ہوئے نبی ﷺ پر نفسانی شہوت کا الزام لگاتا ہے۔ (۱۳)

برصغیر کے پادریوں نے ایک پروپیگنڈہ یہ بھی کیا کہ اب مسلمانوں نے نبی مکرم ﷺ کے سیدہ زینبؓ سے نکاح مبارک کے متعلق ان واقعات کا انکار کرنا شروع کر دیا ہے جن میں اس نکاح کی وجہ سیدہ زینبؓ کے حسن و جمال یا بے پردہ دیکھنے کے سبب طلاق و نکاح کا ذکر ہے۔ چنانچہ پادری خواجہ لکھتا ہے:

"مگر دور حاضر کے مسلمان ان واقعات کو آنحضرت کی شان کے خلاف ہونے کے باعث باطل سمجھتے ہیں"۔ (۱۴)

ان پادریوں کے الزامات واتہامات کا جائزہ لیتے ہوئے ہم سیدہ زینبؓ سے نکاح کی حقیقت اور اس کے مقاصد کو بہ نظر غائر دیکھتے ہیں اور اس بات کی تحقیق کرتے ہیں کہ آیا یہ نکاح حکم الٰہی اور شرعی مصلحت کے تحت ہوا تھا یا پھر جیسا پادریوں کی رائے ہے، اس بنیاد پر ہوا تھا۔

سیدہ زینبؓ کے نکاح کا اصل واقعہ: سیدہ زینب بنت جحشؓ کے نکاح اور ام المومنین کا درجہ پانے کے واقعہ کی جامع تفصیل سورۂ احزاب میں مذکور ہے۔ اس نکاح مبارکہ کا تذکرہ قرآن کریم میں یوں ہے:

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ	جب کہ تو اس شخص سے کہہ رہا تھا جس پر اللہ تعالیٰ نے بھی انعام کیا اور تو نے بھی کہ تو اپنی بیوی کو آباد رکھ اور اللہ تعالیٰ سے ڈر و اور تو اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھا جسے اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا تھا اور تو لوگوں سے خوف کھاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس کا زیادہ حق دار تھا کہ تو اس

لَا یَکُوْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِیَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا (۱۵)

سے ڈرے۔ پس جب کہ زید نے اس عورت سے اپنی غرض پوری کرلی، ہم نے اسے تیرے نکاح میں دے دیا تا کہ مسلمانوں پر اپنے پالکوں کی بیویوں کے بارے میں کسی طرح کی تنگی نہ رہے۔ جب کہ وہ اپنا جی ان سے بھرلیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم تو ہو کر ہی رہنے والا تھا۔

حضرت زیدؓ پر اللہ تعالیٰ کا یہ احسان تھا کہ انہیں اسلام کی توفیق دی۔ نبی کریم ﷺ نے انہیں غلامی سے آزادی دی اور ان سے آپ ﷺ کو اس قدر محبت تھی کہ ''حب الرسول'' کہا جاتا تھا۔ حضرت عائشہؓ کا ارشاد ہے کہ جس لشکر میں نبی کریم ﷺ انہیں بھیجتے تھے اس لشکر کا سرداران ہی کو بناتے تھے۔ اگر یہ زندہ رہتے تو رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ بن جاتے۔ (۱۶)

حضرت زید بن حارثہؓ کے نکاح کا پیغام لے کر نبی کریم ﷺ حضرت زینب بنت جحشؓ کے پاس گئے۔ انہوں نے کہا میں ان سے نکاح نہیں کروں گی۔ آپ ﷺ نے فرمایا ایسا نہ کہو، نکاح کرلو! حضرت زینبؓ نے جواب دیا کہ اچھا پھر مہلت دیجیے، میں سوچ لوں، ابھی باتیں ہو رہی تھیں کہ وحی نازل ہوئی اور یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

وَمَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ یَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیْنًا (۱۷)

کسی مسلمان مرد و عورت کو اللہ اور اس کے رسول کے فرمان کے بعد کسی امر کا اختیار باقی نہیں رہتا۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی جو بھی نافرمانی کرے وہ صریح گمراہی میں پڑے گا۔

اس آیت کریمہ کو سن کر حضرت زینبؓ نے فرمایا: یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ اس نکاح سے رضامند ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! تو حضرت زینبؓ نے جواب دیا کہ بس پھر مجھے کوئی انکار نہیں، میں اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کی نافرمانی نہیں کروں گی، میں نے اپنا نفس ان کے نکاح میں دے دیا۔ سیدہ زینبؓ اپنے قریشی نسب کی وجہ سے آزاد کردہ غلام سے نکاح کو پسند نہیں کرتی

تھیں۔(۱۸)

یہ نکاح ایک سال اور کچھ اوپر تک باقی رہا لیکن پھر ناچاقی شروع ہوگئی۔حضرت زیدؓ نے حضور اکرم ﷺ کے پاس آکر شکایت کی تو آپ ﷺ انہیں سمجھانے لگے کہ گھر نہ خراب کرو، اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔(۱۹)

نبی اکرم ﷺ کیا بات چھپاتے تھے؟: نبی اکرم ﷺ کو بذریعہ وحی معلوم ہو چکا تھا کہ آپ ﷺ کا نکاح سیدہ زینبؓ سے ہونے والا ہے اور حضرت زیدؓ انہیں طلاق دیں گے۔اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب محمد ﷺ کی فطری حیا اور عامۃ الناس کی قیاس آرائیوں اور اعتراضات سے بچنے کی نیک نیت پر مبنی سوچ پر اس لیے بہ ظاہر عتاب آمیز حکم فرمایا کہ آپ ﷺ لوگوں کے اشکالات و غلط فہمیوں کی پروا کر رہے تھے۔آپ ﷺ اس لیے زیدؓ کو طلاق سے منع کرتے رہے تاکہ جہلا و منافقین کو طعن و تشنیع کا موقع نہ ملے۔مگر اللہ تعالیٰ کو عرب معاشرے کے غلط رواج کا خاتمہ مقصود تھا اور وہ بھی اپنے نبی ﷺ کے "اسوۂ حسنہ" کی احسن صورت میں۔اس لیے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا (۲۰)	تاکہ اہل ایمان پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارہ میں کچھ تنگی نہ رہے جب وہ ان سے اپنا جی بھر چکیں۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ اس نکاح میں دینی مصلحت تھی، اس لیے اس میں ملامت کی پروا نہیں کرنی چاہیے تھی۔(۲۱)

امام زین العابدینؒ اس آیت کریمہ کا شان نزول بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ کو خبر دے چکا تھا کہ زینبؓ آپ ﷺ کی بیویوں میں شامل ہونے والی ہیں مگر جب زیدؓ نے آکر ان کی شکایت آپ ﷺ سے کی تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ اللہ سے ڈرو اور اپنی بیوی کو نہ چھوڑو! اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تمہیں پہلے خبر دے چکا تھا کہ میں تمہارا نکاح زینبؓ سے کرنے والا ہوں، تم زیدؓ سے یہ بات کہتے وقت اس بات کو چھپاتے رہے جسے اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا تھا۔(۲۲)

منافقین کے طعن کا رد: اللہ تعالیٰ نے منکرین و منافقین کے اس نکاح پر اعتراضات کو

صریحاً مردود قرار دیتے ہوئے فرمایا:

مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا (۲۳)

جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے لیے حلال کی ہیں ان میں نبی پر کوئی حرج نہیں ۔ یہی دستور الٰہی ان میں بھی رہا جو پہلے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کے کام اندازے پر مقرر کیے ہوئے ہیں۔

حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

وھذا رد علی من توھم من المنافقین نقصا فی تزویجه امراة زید مولاہ و دعیه الذی کان قد تبناہ (۲۴)

اس آیت کریمہ میں منافقوں کے اس قول کا رد ہے جو کہ نبی کریم ﷺ کے اپنے آزاد کردہ غلام اور متبنی کی بیوی سے نکاح کے متعلق اعتراض پر مبنی تھا۔

قرآن مجید کی حفاظت کی دلیل: نکاح زینبؓ کے متعلق آیت کریمہ سے اس بات کا واضح ثبوت ملتا ہے کہ قرآن مجید کلام الٰہی ہے۔ انسانی عمل واثر کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ چنانچہ سیدہ عائشہؓ فرماتی ہیں:

لَوْ كَتَمَ مُحَمَّدٌ ﷺ شَيْئًا مِمَّا اُوْحَى اللّٰهُ اِلَيْهِ مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ لَكَتَمَ (وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَاهُ) (۲۵)

حضرت محمد ﷺ اگر اللہ تعالیٰ کی وحی کتاب اللہ میں سے ایک آیت بھی چھپانے والے ہوتے تو اس آیت کو چھپا لیتے ”اور تو اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھا جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا اور تو لوگوں سے خوف کھاتا تھا، اللہ تعالیٰ اس کا زیادہ حق دار تھا کہ اس سے ڈرے“۔

قرآن مجید چونکہ کلام الٰہی ہے اور اس کو نبی مکرم ﷺ نے مکمل طور پر امانت ودیانت سے لوگوں تک پہنچادیا۔ کسی قسم کی کمی بیشی نہیں فرمائی۔ اگر آپ ﷺ (نعوذ باللہ) خود قرآن بناتے ہوتے یا اس کو اپنی مرضی سے بدل دیتے تو پھر جن آیات میں بظاہر اعتراض پیدا ہوتا ہے تو ان

آیات کو قرآن مجید کا حصہ کیوں رہنے دیتے۔ سلیم الفطرت لوگوں کے لیے اس قسم کے واقعات سے قرآن و اسلام اور رسول اللہ ﷺ کی سچائی تسلیم کرنے کی صاف صاف دلیل پائی جاتی ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا ہے کہ اس کلام کو نبی ﷺ اپنی خواہش سے بدلنے کے مجاز نہیں بلکہ آپ ﷺ کے دل میں ایسی کوئی خواہش نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ مَا يَكُوْنَ لِيْ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِيْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَيَّ اِنِّيْ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۲۶)	آپ یوں کہہ دیجیے کہ مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ میں اپنی طرف سے اس میں ترمیم کردوں، بس میں تو اسی کا اتباع کروں گا جو میرے پاس وحی کے ذریعہ سے پہنچا ہے، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں۔

منافقین کے دلائل کی حقیقت: سیدہ زینبؓ سے نکاح کے متعلق کئی غیر صحیح و غیر مستند آثار منقول ہیں۔ لوگوں کو خبر ہو کہ اس واقعہ کی حقیقت کیا ہے؟ اور تمام روایات کو ایک جگہ جمع کر دینا بھی بعض سیرت نگاروں، مفسروں اور محدثوں کا اسلوب تھا لیکن ایسی روایات و آثار کی تحقیق و تنقید کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ام المومنین زینب بنت جحشؓ کے متعلق بعض آثار و واقعات کے غیر صحیح ہونے کی صراحت کرتے ہوئے حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

ذکر ابن جریر وابن ابی حاتم ھاھنا آثارا عن بعض السلفؒ احببنا ان نضرب عنها صفحا لعدم صحتها فلا نوردھا وقد روی الامام احمد ھاھنا ایضا حدیثا من روایة حماد بن زید عن ثابت عن انس فیه غرابة ترکنا سیاقه (۲۷)	ابن جریر اور ابن حاتم نے اس جگہ بعض اسلاف سے بعض آثار نقل کیے ہیں۔ ان کے غیر صحیح ہونے کی وجہ سے ہم انہیں نقل نہیں کر رہے ہیں۔ مسند احمد میں ایک روایت حضرت انسؓ سے ہے لیکن اس میں بھی بڑی غرابت ہے۔ اس لیے ہم نے اسے بھی ترک کردیا ہے۔

ابن کثیر کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدہ زینب بنت جحشؓ سے نکاح کے متعلق جو غیر صحیح

واقعات اور قصص ہیں ان کا انکار عموماً محققین نے عقلاً ونقلاً کیا ہے۔ نیز ان واقعات کا آیات کی تعبیر وتشریح سے بھی تعلق نہیں اور نہ سیرت نبویؐ کے تقدس سے۔ مگر بعض مفسرین نے کچھ لغو و بے سروپا باتیں درج کی ہیں۔ ان کے اس تساہل وغفلت پر محققین نے خوب نقد کیا ہے۔ چنانچہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ لکھتے ہیں:

''یہاں بعض اہل تفسیر کے قلم کو لغزش ہوگئی ہے اور بعض ایسے قصے درج کردیئے ہیں جو کہ ایک طرف تو نقلاً بے سند ہیں اور دوسری طرف عقلاً بے سروپا اور شان رسالت کے منافی، یعنی نا قابل قبول، نہ روایتاً نہ درایتاً، محققین مفسرین نے اسی لیے ایسے قصوں کی بلانقل کیے بھی تردید وتکذیب کردی ہے''۔ (۲۸)

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ام المومنین سیدہ زینب بنت جحشؓ سے نکاح کا تذکرہ کرتے ہوئے قابل اعتراض موضوع اور واقعات کے متعلق لکھتے ہیں:

''بعض اہل سیر واہل تفسیر وتواریخ یہ قصہ اس طرح بیان کرتے ہیں جو نہ واقعہ کے مطابق ہے اور نہ حضور اکرم ﷺ کی شان عالی کے مناسب ہے۔ محققین اس کو مفسرین کی زلت یعنی غلطیوں میں شمار کرتے ہیں''۔ (۲۹)

قاضی سلیمان منصور پوری نبی کریم ﷺ کے سیدہ زینبؓ سے تعلق اور مسیحی باطل استدلال کا جائزہ لیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''جب حضرت زینبؓ کا نکاح نبی ﷺ سے ہوا اس وقت ان کی عمر ۳۶ سال کی تھی اور اسلام میں حجاب کا حکم اس وقت نازل نہ ہوا تھا۔ ان دونوں فقروں کو یاد رکھنے کے بعد کوئی شخص اس لغو داستان کو باور نہ کرسکے گا کہ آنحضرت ﷺ، حضرت زینبؓ کے حسن کو دیکھ کر ان پر مائل ہوگئے تھے۔ سیدہ زینبؓ تو آنحضرت ﷺ کی حقیقی پھوپھی کی بیٹی ہیں۔ آنکھوں کے سامنے پلیں بڑھیں، ان کی شکل وصورت کیوں کر آنحضرت ﷺ سے پوشیدہ رہ سکتی تھی۔ پھر ۳۶ سالہ عورت کا حسن اور وہ بھی عرب جیسے گرم ملک کی عورت جہاں عورتوں کا شباب جلد ڈھل جاتا ہے، ایسا کیوں کر مانا جاسکتا ہے کہ حضرت زیدؓ (ایک آزاد کردہ غلام) تو

اس سے بیزار ہو جائیں اور سید الانبیاء امام الاتقیاء اس پر شیفتگی کا اظہار کریں۔ عقل اور عادت، تجربہ اور مشاہدہ ایسی واہی باتوں کی تکذیب کے لیے کافی ہیں"۔ (۳۰)

مولانا ادریس کاندھلوی نے بھی سیرت رسول ﷺ کے متعلق مکروہ واقعات و تاثرات کا عقلی و نقلی رد فرمایا ہے۔ (۳۱)

اسی طرح نکاح سیدہ زینبؓ کے حوالے سے غلط فہمیوں کا رد کرتے ہوئے سید جمال حسینی لکھتے ہیں:

> "معلوم ہو کہ بعض علماء نے حضرت زینبؓ کے بارے میں ایسا واقعہ بیان کیا ہے کہ کوئی اہل اسلام آنحضرت ﷺ کی شان میں یہ اعتقاد نہیں رکھ سکتا"۔ (۳۲)

ان دلائل سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ مسیحی مفکرین بے سروپا اور غیر صحیح منکر و موضوع واقعات سے من مانی تاویلات پیش کرتے ہیں۔ ان کا استدلال و استنباط باطل ہے۔ اس لیے علمائے امت نے ان کے اتہامات کا ہر اعتبار سے رد کیا ہے۔

حوالہ جات

(۱) احمد شاہ، پادری: امہات المومنین، ص ۱۲۔

(۲) Watt, W., Montgomary: Muhammad at Medina Oxford University Press, London, 1956, P:277.

(۳) الاحزاب (۳۳): ۵۰۔ (۴) مودودی، ابوالاعلیٰ، سید، مولانا: تفہیم القرآن (ادارہ ترجمان القرآن، لاہور) ۱۱۵/۴۔ (۵) قاضی سلیمان منصور پوری: رحمۃ للعالمین، ۱۱۷/۲۔ (۶) استثنا (۲۱): ۱۰-۱۴۔ (۷) سلاطین (۱)، (۱۱): ۲-۵۔ (۸) احمد شاہ، پادری: امہات المومنین، ص ۷۰۔ (۹) ایضاً، ص ۷۱۔

(۱۰) Muir, William: Mohammad and Islam, Draft Publishers Ltd. London, 1986, P:130.

(۱۱) ٹھاکر داس، پادری: ذنوب محمدیہ، ص ۱۹۔ (۱۲) ایضاً، ص ۱۸۔ (۱۳) ٹھاکر داس، پادری: سیرت مسیح المحمدیہ، ص ۲۱۔ (۱۴) خواجہ قران السعدین، ص ۲۸۔ (۱۵) الاحزاب (۳۳): ۳۷۔ (۱۶) ابن کثیر: تفسیر القرآن العظیم، ۱۸۲/۵۔ (۱۷) الاحزاب (۳۳): ۳۶۔ (۱۸) ابن کثیر: تفسیر القرآن العظیم، ۱۷۹/۵۔ (۱۹)

ایضاً، ۱۸۴/۵۔ (۲۰) الاحزاب (۳۳): ۳۷۔ (۲۱) دریابادی: عبدالماجد، مولانا: ترجمہ تفسیر القرآن، ص ۴۸۹۔ (۲۲) ابن کثیر: تفسیر القرآن العظیم، ۱۸۳/۵۔ (۲۳) الاحزاب (۳۳): ۳۸۔ (۲۴) ابن کثیر: تفسیر القرآن العظیم، ۱۸۴/۵۔ (۲۵) ایضاً، ۱۸۳/۵۔ (۲۶) یونس (۱۰): ۱۵۔ (۲۷) ابن کثیر: تفسیر القرآن العظیم، ۱۸۲/۵۔ (۲۸) دریابادی: عبدالماجد، مولانا: ترجمہ تفسیر القرآن، ص ۴۸۹۔ (۲۹) عبدالحق: مدارج النبوۃ، مترجم: سید غلام معین الدین نعیمی، (شبیر برادرز، لاہور، ۲۰۰۴ء)، ۵۵۲/۲۔ (۳۰) قاضی سلیمان منصور پوری: رحمۃ للعالمین، ۱۶۰/۲۔ (۳۱) دیکھیے: ادریس کاندھلوی: سیرۃ المصطفیٰ، ۳۱۲/۳۔ (۳۲) جمال حسینی، سید: روضۃ الاحزاب، مترجم: مفتی عزیز الرحمٰن، (شہزاد پبلی کیشنز، لاہور)، ص ۲۵۷۔

کتابیات

القرآن الکریم۔

کتاب مقدس۔

ابن کثیر، ابوالفداء، عماد الدین اسماعیل بن کثیر، حافظ، امام: تفسیر القرآن العظیم دار الکتاب العربی، بیروت، ۲۰۰۵ء۔

احمد شاہ، پادری: امہات المومنین، پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، لاہور۔

جی ایل ٹھاکر داس، پادری: سیرت مسیح والمحمدیہ، پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، لاہور۔

جی ایل ٹھاکر داس، پادری: ذنوب محمدیہ، پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، لاہور۔

حسینی، جمال سید: روضۃ الاحباب، مترجم: مفتی عزیز الرحمٰن، شہزاد پبلی کیشنز، لاہور۔

خواجہ قران السعدین، آغا شہباز خان، سیال کوٹ، ۱۹۲۶ء۔

دریابادی، عبدالماجد، مولانا: ترجمہ وتفسیر قرآن، تاج کمپنی، لاہور۔

عبدالحق دہلوی، محدث، مدارج النبوۃ، مترجم: سید غلام معین الدین نعیمی، شبیر برادرز، لاہور، ۲۰۰۴ء۔

کاندھلوی، محمد بن ادریس: سیرۃ المصطفیٰ، فرید بک ڈپو، لاہور، ۱۹۹۷ء۔

منصور پوری، محمد سلیمان، سلمان، قاضی: رحمۃ للعالمین، مکتبہ اسلامیہ، فیصل آباد۔

مودودی، ابوالاعلیٰ، سید، مولانا: تفہیم القرآن، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور۔

Watt, W., Montgomary: Muhammad at Medina Oxford University Press, London, 1956,

اخبار علمیہ

حدیث میں آتا ہے کہ آنحضور ﷺ جس راہ سے گذرتے تھے ایک بڑھیا آپ ﷺ کے راستہ میں کوڑا کرکٹ اور کانٹے وغیرہ پھینک دیا کرتی تھی، جب ایک روز آپ ﷺ گذرے تو یہ منظر نہ دیکھ کر آپ ﷺ اس بڑھیا کے گھر تشریف لے گئے اور اس کی خیریت دریافت فرمائی، اس واقعہ کو بنیاد بنا کر دہلی کے راج ہنس پبلی کیشن نے چوتھے درجہ کی ہندی کی کتاب "بھاشا مینکا" کے سبق ۱۸، ص ۱۰۷ پر حضور پاک ﷺ کی خیالی تصویر بنائی جس میں آپ ﷺ اس بوڑھی عورت سے خیریت دریافت فرما رہے ہیں، حضور ﷺ کی تصویر کشی اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے اور مسلمانوں کے نزدیک یہ گستاخانہ فعل ہے، اس لیے آل انڈیا ملی کونسل نے اس کے خلاف سخت احتجاج کرتے ہوئے مرکزی حکومت سے اپیل کی ہے کہ ناشر کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔

تعلیمات و افکار کی نشر و اشاعت کا اہم ذریعہ ٹی وی یا انٹرنیٹ ہے، ٹی وی نشریات میں ریالٹی شو کو شائقین بہت پسند کرتے ہیں، خبر کے مطابق ملیشیا کا مقبول عام اسلامی ریالٹی ٹی وی شو "نوجوان امام" کے دوسرے سیزن کا آغاز ہو چکا ہے، اس میں شرکت کے خواہش مند حضرات کی طویل فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنوبی مشرقی ایشیا میں اسلام کی آواز دور دور تک پہنچ رہی ہے، "نوجوان امام" شو دراصل ۱۸ سے ۲۷ برس کی درمیانی عمر کے ایسے مسلم نوجوانوں کی صلاحیتوں کا مقابلہ ہے جو "مالے" زبان میں اظہار خیال کر سکتے ہیں، مقابلہ میں کامیاب نوجوان کو "مذہبی امام" کا تاج پہنایا جائے گا، اس پروگرام کو ملایشیا سٹیلائٹ تیار کرتا ہے، اس کے منتظم ازلان بصر کا کہنا ہے کہ آخری نتیجہ ہم اللہ پر چھوڑتے ہیں اور اس سے ہماری کوشش نوجوانوں کو اسلام سے قریب لانا ہے، شو میں حصہ لینے والے نوجوان خوش نما سیاہ سوٹ میں ملبوس ہوں گے، مختلف شعبوں مثلاً تلاوت قرآن، غسل میت، اسلامی آداب کے مطابق ذبیحہ نیز نوجوان مسلم جوڑوں کو مفید مشورہ دینے کے معاملہ میں ان کی صلاحیتوں کو پرکھا جائے گا، "نوجوان امام" شو

گذشتہ برس منعقد ہوا تھا، پروگرام کی مقبولیت کے پیش نظر اس شو میں ملیشیا کے علاوہ انڈونیشیا، سنگاپور، برونئی اور تھائی لینڈ وغیرہ کے نوجوانوں کو شرکت کی دعوت دی گئی ہے، تقریباً ایک ہزار نوجوانوں نے ابتدائی جانچ کرائی، جس میں صرف دس فیصد منتخب ہوئے، یہ شو ۱۰ر ہفتے چلے گا اور کامیاب امیدوار کو ایک کار، ایک مسجد کی امامت، مدینہ یونیورسٹی کی ۴ سالہ اسکالرشپ اور تقریباً ۱۰ر ہزار ڈالر اور ایک کار پیش کی جائے گی۔

عام طور پر جب ہوائی جہاز کی ایجاد کا ذکر آتا ہے تو رائٹ برادران چارلس ونڈگ اور چک ایگر وغیرہ کے نام سامنے آتے ہیں حالانکہ اس کے تخیل اور ایجاد کا سہرا نویں صدی عیسوی کے ابتدائی عشرے کے ایک ذہین شخص عباس بن فرناس کے سر ہے، وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ثابت کیا کہ انسان پرندوں کے مانند خلا میں اُڑ سکتا ہے انہوں نے اس اُڑان کا مظاہرہ بھی کیا جو انسانی تاریخ میں انسانی پرواز کا پہلا تجرباتی واقعہ تھا، اس حقیقت کا اعتراف میوسٹن یونیورسٹی میں میکانیکل انجینئرنگ اور شعبہ تاریخ کے پروفیسر جان وین ہارڈ نے اپنی تصنیف ''دی انجنس آف انجنیوٹی''، میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ انسانی تاریخ میں سائنسی طریقہ پر خلا میں پرواز کرنے کی سب سے پہلے کوشش عباس بن فرناس نے کی تھی، ہوائی جہاز کی ایجاد سے ایک ہزار سال قبل عباس بن فرناس نے اس کو جان لیا تھا اور بغیر کسی انجن کے سہارے اس پر عملی تجربہ کر کے ثابت بھی کیا تھا، اس کے علاوہ اس عظیم سائنس داں کی ایجادات میں بلور اور اس کے کاٹنے کا طریقہ، خاص قسم کا گھڑیال اور کرۂ فلکی بھی ہے۔ (اس کی تفصیلی رپورٹ ماہنامہ مسلم میں شائع ہوئی ہے)

مسلمانوں کے دور حکومت میں ہندوستان میں جو محلات، قلعے، سرائیں اور مقبرے وغیرہ بنائے گئے، ان کی حفاظت وصیانت اور دیکھ ریکھ اب حکومت کی ذمہ داریوں میں شامل ہے، ان عمارتوں کی دلکشی، حسن اور جاذبیت سیاحوں کے دامن دل کو اپنی جانب بطور خاص کھینچ لاتی ہے، دلچسپ اور خاص بات ہے کہ اکثر تاریخی عمارتیں یا مقامات حکومت کی آمدنی کا ذریعہ بھی ہیں اس آمدنی کو حکومت ان کے تحفظ اور رفاہی کاموں پر صرف کرتی ہے، ایک رپورٹ کے مطابق ۲۰۰۸ء سے ۲۰۱۱ء تک تاج محل کی کل آمدنی ۵۴۱۴۰۳۵۴۰، قلعہ آگرہ کی ۳۰۷۵۴۱۱۹۰،

فتح پور سیکری کی ۱۴۲۶۰۷۸۳۰، مقبرۂ اکبر (سکندرہ) کی ۱۸۲۵۶۲۷۰، مقبرۂ مریم (سکندرہ) کی ۲۶۰۵۹۰، مقبرہ اعتمادالدولہ کی ۱۳۷۷۶۱۱۵، رام باغ کی ۵۴۴۲۸۵ روپے ہوئی، یہ صرف ان سات تاریخی عمارتوں کی حالیہ چار سالہ آمدنی کی ایک سرکاری رپورٹ ہے۔ جس کے مطابق کل ۱۱۰۲۴۳۸۹۸۲۰ (ایک ارب ۲ کرور ۴۳ لاکھ ۸۹ ہزار ۸ سو ۲۰ روپے) کی آمدنی ہوئی۔

سعودی عرب حکومت نے ایٹمی سولار جیوتھرمل اور دیگر متبادل توانائی کے ذرائع استعمال کرنے کا فیصلہ کیا ہے، تاکہ ملک میں توانائی کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کی تکمیل ہو سکے، کیونکہ وہاں توانائی کی طلب کی شرح ۸ فیصد سالانہ کے لحاظ سے بڑھ رہی ہے، ماہرین کے تخمینہ کے مطابق ۲۰۳۲ء میں سعودی عرب میں توانائی کی ضرورت میں تین گنا اضافہ کا امکان ہے، اس کے لیے ۸۰ گیگا واٹس کے توانائی تنصیبات کی ضرورت پڑ سکتی ہے، اسی ضرورت کے پیش نظر سعودی حکومت نے اس سے قبل فرانس کے ساتھ پہلا نیوکلیر معاہدہ کیا تھا، اب مرکزی کابینہ نے شاہ عبداللہ سٹی برائے نیوکلیر اور تجدید نو توانائی کے صدر ہاشمی یمنی کو چینی حکام کے ساتھ پرامن ایٹمی توانائی تعاون کے معاہدہ پر مامور کیا ہے، ہاشمی یمنی نے کہا کہ اس معاہدہ کے نتیجہ میں عرب میں متبادل توانائی کے ذرائع کا استعمال کرتے ہوئے پاور اسٹیشن کی تعمیر کے دیرینہ منصوبہ جات کی تکمیل ہوگی اور دونوں ممالک پرامن ایٹمی توانائی کی پیداوار اور ٹیکنالوجی کے تبادلہ میں ایک دوسرے کا تعاون کریں گے۔

برطانوی اخبار "ڈیلی میل" کے مطابق برطانوی سائنس دانوں نے ایک تجربہ گاہ میں مصنوعی دل تیار کرنے میں کامیابی حاصل کرلی ہے، چند ہفتوں میں یہ قلوب حرکت بھی کرنے لگیں گے، اس سے لاکھوں مریضان قلب کی ڈھارس بڑھ گئی ہے، سائنس دانوں نے یہ قلوب عطیہ دہندگان کے اعضاء سے خلیے علاحدہ کر کے بنائے ہیں، یہ تجربہ دنیائے طب میں اہم پیش رفت ہے۔

ک، ص اصلاحی

تلخیص وتبصرہ

مدرسۃ الفلاح دبئی
اوراس کے بانی محمد علی زینل

''تقریباً سال بھر پہلے مارچ ۲۰۱۰ء میں شیخۃ المطیر ی نے ایک مضمون ان کتابوں کی مدد سے سپرد قلم کیا تھا''محمد علی زینل نهضة و زعیم اصلاح و موسس مدارس الفلاح ، مرتبه محمد احمد الشاطری ، تاریخ التعلیم فی الامارات خلال الحقبة الزمنية ۱۹۰۰ – ۱۹۹۳ ، اعداد قسم البحوث بوزارة التربية والتعليم ، تاريخ التعليم فی دبی ۱۹۱۲ – ۱۹۷۲ ، مرتبه عارف الشيخ ، یہ مضمون مرکز جمعۃ الماجد کے ترجمان سہ ماہی رسالہ ''اخبار المرکز'' میں شائع ہوا، یہ مضمون چونکہ دبئی کی تعلیمی تاریخ سے متعلق ہے اور مفید اور پراز معلومات ہے، اس لیے قارئین معارف کی خدمت میں اس کی تلخیص پیش کی جاتی ہے''۔ ک، ص اصلاحی

مدرسۃ الفلاح کے بانیوں میں محمد علی زینل کا شمار ہوتا ہے، دبئی میں اس کی متعدد شاخیں ہیں، بیسویں صدی عیسوی کی ابتداء میں اس کی بنیاد رکھی گئی۔

حاجی محمد علی زینل حجازی الاصل ہیں، کسی زمانے میں ان کا خاندان حجاز سے نکل کر عرب کے دوسرے علاقوں میں آباد ہوگیا تھا، لیکن ماضی قریب میں وہ دوبارہ سرزمین حجاز واپس آگیا، زینل کی ولادت ۱۸۸۵ء میں جدہ میں ہوئی، شیوخ حرم مکہ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ مزید تعلیم کے لیے جامعہ ازہر گئے، ان کی خواہش مصر میں قیام کی تھی لیکن تجارت میں والد کی معاونت کے خیال سے لوٹ آئے اور کاروباری سلسلے میں وہ ہندوستان کے عروس البلاد ممبئی بھی آئے اور موتیوں کی تجارت میں لگ گئے، کچھ ہی دنوں میں ان کا شمار موتیوں کے بڑے تاجروں میں ہونے لگا تو انہوں نے ممبئی ہی کو اپنا مستقر بنالیا، یہیں سے لندن، پیرس، جدہ اور دوسرے خلیجی ممالک کا بھی تجارتی اغراض سے سفر کرتے رہے، خوش حالی آئی اور فراغ نصیب ہوا تو ان کے دل میں مدرسہ کھولنے کا خیال آیا، چنانچہ انہوں نے ۱۹۰۵ء میں مدرسۃ الفلاح کے نام سے جدہ میں ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی جو جدہ کا پہلا مدرسہ تھا، اس کے بعد

مکہ مکرمہ، دبئ، ممبئی اور بحرین وغیرہ میں اس کی متعدد شاخیں قائم ہوئیں، دبئ میں مدرسۃ الفلاح کی تاریخ قیام کے سلسلہ میں لکھا گیا کہ ۱۹۲۶ء - ۱۹۲۷ء کے دوران اس کا قیام عمل میں آیا، شروع میں مدرسۃ الفلاح میں درجہ اول سے نوتک کی تعلیم دی جاتی تھی، تعلیم کی مدت آٹھ مہینے تھی، چار مہینے تعطیل رہتی تھی، تعلیم صبح وشام دونوں وقت ہوتی تھی، طلبہ کی حاضری کے لیے رجسٹر تھا، مدرسہ کا نگراں طلبہ کی غیر حاضری کی وجہ دریافت کرنے کے لیے اس کے ذمہ دار کے پاس جاتا اور اس بابت ان سے دستخط بھی حاصل کرتا جو مدرسہ کے ذمہ دار کے پاس پیش ہوتی، مدرسے میں دینی نصاب توحید، فقہ، سیرت، حدیث اور تفسیر کے علاوہ عربی زبان، ریاضی اور تاریخ کی کتابیں بھی شامل نصاب تھیں، معلموں کو سالانہ تقریباً ۳۰ روپے اور بعد میں ۱۵ روپے ماہانہ مشاہرہ دیا جاتا تھا، جب طلبہ کی تعداد تیس تک پہنچی اور اس میں مزید اضافہ ہوا اور مدرسہ تعلیم کی جانب لوگوں کا رجحان بڑھا تو بانی مدرسہ محمد علی زینل نے جدہ میں قائم مدرسہ کے طرز پر مدرسۃ الفلاح کی جدید عمارت کی تعمیر کا منصوبہ بنایا، حالانکہ اس زمانے میں موتیوں کی تجارت کساد بازاری کا شکار تھی، ۱۹۴۰ء میں مدرسہ کی آمدنی بند ہوگئی تو محمد نور بن سیف اور ان کی ساتھی اساتذہ نے مستطیع طلبہ پر حسب استطاعت مہینے میں ایک یا دو روپے فیس مقرر کی، جب دبئ میں تعلیم کو ترقی نصیب ہوئی اور حاکم دبئ شیخ سعید بن مکتوم نے مدرسے کے اخراجات کی ذمہ داری خود قبول کرلی تو دوبارہ اس میں مفت تعلیم دی جانے لگی، اس کے فارغین کے متعلق شیخ احمد بن ظبوی کا بیان ہے کہ اس مدرسہ میں درجہ نو تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد طالب علم عہدۂ قضا وتدریس کا اہل ہوجاتا، ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۵ء تک شیخ عبدالرحمٰن محمد حافظ الانصاری نے مدرسہ کی نظامت سنبھالی، ان کے مشہور شاگردوں میں شیخ راشد بن سعید المکتوم، شیخ بطی بن سہیل، راشد بن جمہور، عبید بن صقر بن غباش، شیخ محمد بن احمد الخزرجی، سید ہاشم الہاشمی، عبداللہ الہاشمی، حمد بن مطر بن مصبح اور ان کے بیٹے مطر وغیرہ ہیں، اس زمانے میں جن اساتذہ نے اس مدرسہ میں تدریسی فرائض انجام دیے ان میں چند کے نام درج ذیل ہیں: شیخ محمد نور سیف، راشد بن جمہور، شیخ محمد بن طاہر، شیخ احمد القنبری، سید محمد الشنقیطی، شیخ عبداللہ الاوفی، شیخ محمد العبسی۔

بعض مشہور فارغین کے نام یہ ہیں: شیخ راشد بن مانع المکتوم، محمد بن دعفوس، محمد بن یوسف الشیبانی، عبید بن صقر غباش، محمد صالح الریس، شیخ محمد الخزرجی، مطر الماجد، احمد بن محمد بن دلموک، حسن بوملحہ، احمد سعید غباش، محمد بوملحہ، احمد بن ظبوی، عمر الماجد علی الجزیری، سالم بن کنید، عبدالجبار الماجد۔

معارف کی ڈاک

معارف، مشورے اور گزارشیں

کلیہ دار العلوم،
جامعہ قاہرہ، مصر العربیہ

محترم جناب مدیر معارف، تحیۃ طیبہ

امید ہے کہ آپ سبھی حضرات خیر و عافیت سے ہوں گے، فون پر آپ کی اطلاع سے تسلی ہوئی کہ مقالہ آپ کو مل گیا ہے، آپ کے بھیجے ہوئے ''معارف'' کو آج کل پڑھ رہا ہوں، الحمدللہ ''معارف'' کا خاص معیار ہے جس میں وہ سارے اردو مجلات پر فوقیت رکھتا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ برصغیر کے رسائل میں ''معارف'' کو مقام اول حاصل ہے، ''معارف'' میں مقالات لکھنے والوں کے لیے ناچیز کے کچھ مشورے ہیں جن پر اگر عمل کیا جائے تو مقالات کے ساتھ ساتھ ''معارف'' کا معیار اور اونچا ہو سکتا ہے، مجلّہ میں شائع شدہ سبھی مقالوں میں ایک کمی یہ نظر آئی کہ ہجری اور میلادی تاریخوں کی مطابقت بہت ہی کم جگہوں پر نظر آتی ہے، اس کے علاوہ مقالات میں وارد شخصیات کے مکمل نام نیز ان کی تاریخ وفات اور ان کے حوالے سے لی گئی معلومات کے مآخذ کا کوئی ذکر نہیں، مثال کے طور پر ایک مقالہ میں بنی غسانسہ کے آخری بادشاہ کا ذکر آتا ہے جس کے حوالے سے مقالہ نگار یہ لکھتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں ''جبلہ بن الایہم عرب کا مشہور سردار تھا'' جبکہ وہ روم کی باجگزار ریاست غساسنہ کا آخری بادشاہ گذرا ہے، حاشیہ میں ایک سطر میں اس کا تعارف ضروری تھا، اسی طرح مقالہ میں مقالہ نگار نے ایک جگہ صرف ''شیخ الاشراق'' لکھنے پر اکتفا کیا، جبکہ ان کے پورے نام کے ساتھ ساتھ تاریخ وفات کا لکھنا ضروری تھا، خاص طور پر یہ ضرورت اس لیے بڑھ جاتی ہے جب ایک ہی نام کے کئی جید علماء ہوں، علی سبیل المثال، لقب سہروردی سے دو بڑے عالم اور فلسفی مشہور ہیں:

۱- شہاب الدین عمر السہروردی، صاحب الطریقہ السہروردیہ الصوفیہ، جن کی مشہور کتاب ''عوارف المعارف'' ہے اور جن کا انتقال ۶۳۲ھ/۱۲۳۴ء میں ہوا، جب کہ اسی نام اور لقب سے شہاب الدین یحیٰ بن حبش بن جبش السہروردی (ت ۵۶۵ھ/۱۲۶۶م) بھی مشہور ہیں، جنہیں تاریخ میں ''قتیل'' اور ''اشراقی فیلسوف'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جن کی کتاب ''حکمۃ الاشراق'' کو فلسفہ میں ایک بڑا مقام حاصل ہے۔ اسی طرح ابن رشد کی جلاوطنی کے حوالے سے خلیفہ منصور کا مقالہ نگار نے ذکر کیا ہے مگر یہ کون خلیفہ منصور ہیں اس کی

کوئی توضیح نہیں، یہ صرف چند مثالیں ہیں، ہر مقالہ میں اس طرح کی خامیاں موجود ہیں جن کے حوالے سے ''معارف'' کے ذریعہ آپ کو اعلان کرنا چاہیے، مجلّہ کے سرورق پر صرف میلادی تاریخ کیوں؟ ہجری تاریخ لکھنا ''معارف'' کے لیے واجب ہے، مجلّہ میں وارد موضوعات کی ترتیب بہت اچھی ہے مگر ''شذرات'' کے کالم سے پہلے ایک صفحہ خاص کریں جس میں ''معارف'' میں مقالات کی اشاعت کے حوالے سے مقالہ نگاروں کے لیے کچھ شرطیں بیان کردیں، نیز ''معارف'' میں شائع ہونے کے لیے مقالات کے منہج اور اصولوں کو جلی حروف میں لکھیں، اشاعت کی شرائط میں یہ ذکر کرنا نہ بھولیں کہ ہر مقالہ نگار اپنے مقالہ کا انگریزی زبان میں ۲۰۰ الفاظ میں ملخص بھی بھیجے، نیز مقالہ کا عنوان صحیح طور پر انگریزی زبان میں ہو، اس حوالے سے شروع میں پریشانی ہوسکتی ہے لیکن ہمیں یہ بات مدنظر رکھنی چاہیے کہ انگریزی خلاصوں کے ساتھ مقالات شائع کرتے رہنے سے ایک وقت ایسا آئے گا کہ انگریزی خلاصوں کی ایک نہایت ہی مفید ببلوگرافی تیار ہوجائے گی، عصر حاضر میں اس کی بہت اہمیت ہے، اس کے حوالے سے آپ کو مجلّہ کے صفحات بھی بڑھانے ہوں گے۔

ایک آخری گذارش یہ بھی ہے جس کے حوالے سے میں پہلے بھی آپ کو لکھ چکا ہوں وہ یہ ہے کہ مقالوں میں مذکور اقتباس شدہ نصوص کو چاہے وہ اصلی زبان میں ہوں یا ترجمہ شدہ ہوں، بین قوسین یا خط کشیدہ الفاظ کے تحت رکھنا زیادہ بہتر ہے، مزید یہ کہ حاشیے ہر صفحہ پر حسب النصوص مذکور ہوں تو قاری کو مضمون پڑھنے نیز متعلقہ حاشیہ کی طرف رجوع کرنے میں آسانی ہوگی۔ دعاؤں کا طالب

صاحب عالم اعظمی ندوی

جناب ایرج افشار کی رحلت

پوسٹ بکس نمبر ۱۱۴،
علی گڑھ، (ہند) ۲۰۲۰۰۱۔

برادر گرامی مراتب زیدمناصبکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

۳؍ مارچ ۲۰۱۱ء کو ایران کے معروف اسکالر اور پبلیشر جناب ایرج افشار دنیا سے رخصت ہوگئے، ایک مخلص کی اطلاع اور فرمائش پر یہ قطعۂ تاریخ لکھا ہے، امید ہے اس کو ''معارف'' میں جگہ دینے کی زحمت فرمائیں گے۔ جویائے خیر

رئیس احمد نعمانی

ادبیات

تاریخ در گذشت دکتر ایرج افشار
دانشمند و پژھشگر معروف ایران

جناب رئیس احمد نعمانی

یگانا مردِ دانا ایرج افشار سخن گوی و سخن سنج و سخن یار
ادیبِ نامور ، استادِ انشأ چراغ بزمِ تحقیقات و جستار
رفیقِ رہروانِ راہِ پارین انیسِ ہمرہانِ تازہ رفتار
کتاب و نامۂ اہلِ ادب را ہمی بودہ امین و ہم نگہدار
مہارت داشت در تالیف و تدوین علم گردیدہ ہم در چاپ آثار
عزیز خاطر دانا و نادان ستودہ از زبانِ خویش و اغیار
چو دل برداشتہ از کارِ دنیا رمیدہ از ہجوم شہر و بازار
بستہ رختِ جان و تن ز منزل جہانیدہ بہ سوی گور رہوار
بجستم سالِ فوتش و ز دلِ من
صدا آمد : ''دریغا ایرج افشار''
۱ ۱ ۰ ۲ ء
(۳/مارچ ۲۰۱۱ء)

پوسٹ بکس نمبر ۱۱۴، علی گڑہ، (ہند) ۲۰۲۰۰۱۔

مطبوعات جدیدہ

رشید احمد صدیقی ثقافتی منظر نامہ: از پروفیسر عبدالحق، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۱۶۸، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: ۲۳۱۵۔ ہڈسن لائن، کنگس وے کیمپ، دہلی ۱۱۰۰۰۹۔

جناب رشید احمد صدیقی کے صاحب طرز ادیب اور باکمال انشاء پرداز ہونے میں کوئی کلام نہیں لیکن ان کی شخصیت ہشت پہل تھی، خنداں سے مجسم گریاں ہونے کے سفر کی اگر تفصیل کی جائے تو خدا جانے کیسے کیسے مقامات ان کے مقام بلند کی تعیین کرتے نظر آئیں، مزاح نگاری ان کی ادبی زندگی کا ایک اہم باب ہے، لیکن اس صنف کو انہوں نے سنجیدہ ظرافت یا ظریفانہ سنجیدگی کا رنگ جس وقار و متانت سے بخشا اس میں ان کا کوئی ثانی نہیں، صحیح کہا گیا کہ ان کی بذلہ سنجی پر ان کے ذوق کی عفت مآبی چھائی رہتی، مسلم یونیورسٹی اور اس کی تہذیب سے عشق، ان کی زندگی اور شخصیت کا سب سے نمایاں عنصرو جوہر ہے، مشک کی طرح اس کی خوشبو عام ہوئی، لیکن یہ محض ادارے سے شیفتگی نہیں تھی بلکہ یہ اسلامی اور مشرقی تہذیب و ثقافت سے والہانہ وابستگی تھی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے جب یہ لکھا کہ وہ مسلم یونیورسٹی کی روایات کے راز داں، اس کی حمیت کے دیدباں، اس کی عزت کے نگہباں اور اس کی آبرو کے پاسبان تھے تو ان کے قول میں مبالغہ ذرا بھی نظر نہیں آیا، وجہ یہی تھی کہ صدیقی صاحب اسلامی تہذیب و ثقافت کے خود بھی نمائندہ تھے اور اسی نمائندگی کے وہ ہمیشہ حدی خواں رہے، غالب، اقبال، اکبر، اصغر، فانی ہوں، شبلی و سلیماں ہوں، ذاکر حسین و اقبال سہیل ہوں یا ندوہ و دارالمصنفین ہو، تہذیبی روایت کا ہر امین ان کے قلب و نظر کا مکین بن گیا، ان کے انتقال کو اب تیس سال سے زیادہ کا عرصہ ہو رہا ہے، ان کی یادوں کی شمعوں سے اردو تہذیب کے بام و در کو جگمگانا چاہیے تھا، مگر افسوس ہے کہ ایسی قندیلیں بہت کم ہیں، زیر نظر کتاب سے تب و تاب کی کمی کی تلافی ہوتی نظر آتی ہے، فاضل مصنف دانشوری کے اسی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جس کی متاع گراں درد و سوز کے سوا کچھ نہیں، جس کو خرد نے نظر حکیمانہ بخشی تو عشق نے حدیث رندانہ بھی عطا کی ہے، جس کی وجہ سے یہ اعتراف حق سامنے آیا کہ ''عصر حاضر میں تہذیب سے جنون عشق کی حد تک وارفتگی کا نام رشید احمد صدیقی ہے، اردو سے

عقیدت رکھنے والا یہ مجذوب صفت پیکر، تخلیقی تاریخ میں منفرد اور غیر متبادل ہے، درد و درماندگی سے دوچار اردو ثقافت کی پرسوز مسیحائی میں کوئی ان کا حریف قلم نہ بن سکا'' رشید احمد صدیقی کے ثقافتی معیار واقدار کی تہہ میں وہی اضطراب اور پیہم اضطراب پنہاں تھا جس سے آشنائی کی دعا ان کے ممدوح شاعر مشرق نے کی تھی، اس کتاب میں ان زیریں لہروں کو دیکھنے اور ناپنے کی کوشش کی گئی ہے، جونپور کی قدیم بستی میں شاہان شرقی کی پرشکوہ عمارتوں کے سایہ میں شعراء، ادباء، علماء اور اہل دل صوفیہ کی تہذیبی علامتوں نے صدیقی صاحب کے فکر و شعور کی تشکیل کی تو گزرے ہوئے قافلہ کے آثار و باقیات نے اس تشکیل میں درد و سوز و گداز کو آمیز کیا، علی گڑھ کی تہذیبی و ثقافتی آب و ہوا میں اس جذبے کو بے کراں ہونا ہی تھا، فاضل محقق مصنف نے اس کتاب میں جس ثقافتی منظر نامہ کو پیش کیا ہے وہ رشید شناسی کے لیے ناگزیر ہے، اس کے علاوہ ان کی برسوں پہلے کی کتاب رشید احمد صدیقی افکار و اسالیب میں شامل خطوط کے علاوہ سو سے زیادہ غیر مطبوعہ خطوط بھی رشید شناسی کا اہم وسیلہ ہیں، گو ان میں ذاتی اور نجی نوعیت غالب ہے تاہم جگہ جگہ کچھ جملے دامن نظر کو بے ساختہ کھینچ لیتے ہیں، جیسے پروفیسر محمود الٰہی کے نام ایک خط میں یہ جملے کہ ''زکوۃ، روپے پیسے، مال معیشت ہی پر واجب نہیں آتی، عزت و فراغت پر بھی عائد ہوتی ہے، اس نکتہ کو کبھی نہ بھلائیے گا''، ''اچھا اور قابل اعتبار وہ شخص ہے جس کی خوشی کا پیمانہ جلد اور صبر و تحمل کا پیمانہ کبھی لبریز نہ ہوتا ہو''، فاضل مصنف کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ''تنقید میں یہی نہیں دیکھتے کہ تنقید نگار نے تنقید کے مطالبات کہاں تک اور کس طرح پورے کیے بلکہ اس کا بھی اندازہ لگاتے ہیں کہ اس کی تنقید اس کی شخصیت کا کس طرح انکشاف کرتی ہے، اس اصول پر آپ پورے اترتے ہیں''، یہی قول اس کتاب کے بارے میں بھی پورے یقین کے ساتھ دہرایا جاسکتا ہے۔

دی ہولی قرآن اینڈ اینمل ورلڈ: از ڈاکٹر سالم (سلیم؟) سلطان اور جناب نجم الرحمٰن فاروقی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۳۶۶، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: صدق فاؤنڈیشن خاتون منزل، حیدر مرزا روڈ، گولہ گنج، لکھنؤ۔ نمبر ۱۸۔

قرآن مجید کے علوم کی وسعت اور اس کی بے کرانی اس کے اعجاز کی ایک اور نشانی ہے، انسان کی قدیم و جدید اور مابعد جدید تاریخ کا کوئی علم یا موضوع اس کے احاطۂ اعجاز سے باہر نہیں، حیوانات اور حیوانیات، جدید سائنس کا ایک اہم موضوع ہے، اسی لیے دور حاضر کے مفسرین اور علوم قرآنیہ کے حاملین

نے اس کو بھی اپنی تحقیق کا موضوع بنایا، اردو میں کئی کتابیں ہیں جن میں سرفہرست مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی کتاب ہے، زیر نظر کتاب انگریزی میں ہے اور فاضل مولفین کی محنت اس احساس کے ساتھ ہے کہ اسلام پر عقیدۂ کامل رکھنے والا یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ زمان و مکان میں کیسے ہی تغیر ہوں، منطق، فلسفہ اور علم فطرت زیر زبر ہوتے رہیں، اسلام ہر حال میں برحق ہے اور یہ ہر زمانے میں علم الکلام کی آبیاری کرتا ہے، جدید سائنس وحی اسلامی کے متغائر نہیں بلکہ یہ اسلامی علوم کے لیے باعث تقویت ہے، اس احساس کی بدولت مولفین نے جدید سائنس کی روشنی میں حیوانیات سے متعلق تمام اہم اطلاعات و معلومات کا خلاصہ کیا اور پھر قرآن مجید کے بیانات کی روشنی میں سائنسی معلومات کا جائزہ لیا، قریب چالیس حیوانات قرآنی کو الگ الگ موضوع بحث بنایا گیا مثلاً ANT چیونٹی کے ذکر میں پہلے آیت، انگریزی ترجمہ، سیاق وسباق، چیونٹی کی ساخت، اقسام، افعال، اتحاد، انصرام، ارتباط وغیرہ کے متعلق جدید ترین معلومات ہیں، پھر مذہب، تمدن اور روایات میں اس کی اہمیت کا بھی ذکر ہے اور یہ سب بڑے دلچسپ انداز میں ہے، اس طرح یہ انگریزی داں طبقے کے لیے علوم قرآنی اور سائنس کے باب میں نہایت مفید کتاب بن گئی ہے، آخر میں ایک اشاریہ بھی بڑا کارآمد ہے، جس میں سورت و آیت کے نمبر کے ساتھ مذکور جانوروں کی نشان دہی کی گئی ہے، کتابیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ متند تفسیروں کے علاوہ دوسرے مراجع وہی ہیں جو وقیع اور قابل اعتماد ہیں، یہ کہنا درست ہے کہ یہ ہر طبقہ اور مذہب کے لیے فائدہ مند اور ایک آفاقی پیغام کی حامل ہے۔

اقبال عرفانی: از ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی، ترتیب جناب ضیاء محمد ضیاء، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۲۸۶، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: بزم رومی واقبال، ۴۰۔ ماڈل ٹاؤن سیال کوٹ، پاکستان۔

ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی کا نام، علامہ اقبال اور ایران کے حوالے سے غیر معروف نہیں، ایران، کشمیر، پاکستان کے ادبی روابط پر ان کے کئی مقالات ہیں، ایرانیوں سے اقبال کے تعارف میں ان کی کتاب رومی عصر بہت مقبول ہوئی، ۱۹۵۳ء میں ان کا اولین فارسی مجموعہ کلام تہران سے شائع ہوا، ۱۹۰۷ سے ۱۹۹۰ تک ان کی زندگی فارسی اور اقبالی ادب سے روشن رہی، اس کتاب میں انہوں نے اسی زندگی کی کچھ جھلکیوں کو جمع کیا لیکن یہ ان کی زندگی میں طبع نہ ہوسکی، لائق مرتب نے اس کو شائع کر کے

ایک کامیاب زندگی کے دلچسپ و مفید لمحات سے روشناس کرانے کا قابل تحسین کام انجام دیا، جاوید اقبال کے الفاظ میں ڈاکٹر عرفانی مبلغ قلب وعرفان تھے ان کا خیال تھا کہ مسلمانان عالم افکار اقبال کے ذریعہ ہی متحد ہو سکتے ہیں اور یہ کہ اسلام کا عنصر اگر قومی زندگی سے خارج کر دیا جاتا ہے تو پاکستان باقی نہ رہ سکے گا، یہ کتاب اسی نقطہ نظر کی تفصیل ہے، افسوس ہے کہ اس پر تبصرہ ایک مدت کے بعد آیا، اختصار کی وجہ سے اس کے مشمولات کا صحیح تعارف بھی نہیں ہوسکا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اقبال شناسی میں اقبال کے ایک شیدائی کی یہ خودنوشت اہمیت کی حامل ہے۔

شعور عروض: از جناب شعور اعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۲۶۴، قیمت ۱۲۵ روپے، پتہ: کتاب دار ۱۰۸/۱۱۰ جلال منزل، تیمکار اسٹریٹ، ممبئی۔ نمبر ۸۔

شعر گوئی اور شعر فہمی کا سلسلہ اردو میں جتنا وسیع ہے، اس کی فنی شناخت اور اعتبار جس علم سے قائم ہے یعنی علم عروض، اس سے واقفیت کا دائرہ اتنا ہی تنگ نظر آتا ہے، یہ کتاب اسی احساس کا نتیجہ ہے جس میں عروض اساسی، اصول تقطیع، عروض الحاقی، علم ہجا، علم صرف ونحو، علم قوافی، علم تنسیق کلمات کے ساتھ محاسن ومعائب سخن جیسے موضوعات پر نہایت آسان ودلنشیں انداز میں گفتگو کی گئی ہے، صاحب کتاب کے والد ماجد خود اس فن کے ماہر تھے، جن کی مجلس میں لائق بیٹے نے عروضی اور فنی مباحث اس عمر میں سنے جب بچے صرف نصیحتیں سنا کرتے ہیں، بے شعوری کی عمر میں جس شعور نے پروان پایا، یہ کتاب اسی کا خوبصورت ثمر ہے اور علم وفن عروض کے طلبہ کے لیے یہ بہترین تحفہ ہے۔

کلیات رہبر: از جناب عبدالعزیز رہبر اعظمی، مرتبہ عبدالہادی اعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۸۸، قیمت درج نہیں، پتہ: فرید بک ڈپو، پرائیویٹ لمیٹڈ، دہلی۔

اعظم گڈھ کے مردم خیز قریہ ابراہیم پور کے رہبر اعظمی زیادہ مشہور نہیں ہوئے لیکن ان کے کلام کے اس منتخب مجموعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ باکمال اور قادر الکلام شاعر تھے، حمد ونعت اور قومی نظموں کے علاوہ غزلوں کا رنگ بھی بڑا شوخ اور کھلتا ہوا ہے

گیسوؤں کو بکھیر مت اے دوست شرح منصور و دار رہنے دے
چارہ گر تیرے بس کی بات نہیں تو مجھے بے قرار رہنے دے

نوجوان اور لائق مرتب نے اس انتخاب کے ذریعہ اپنے حسن انتخاب کی سند فراہم کر دی۔ ع-ص

رسید مطبوعات جدیدہ

۱- **اقبال ایک مردآفاقی (انگریزی سے ترجمہ):** راج موہن گاندھی، مترجم یوسف کمال، صفحات ۸۴، پتہ: اردو بک ڈپو اردو ہال، حمایت نگر، حیدرآباد، انجمن ترقی اردو، راؤز ایونیو، نئی دہلی۔ قیمت ۸۰ روپے

۲- **موضوع وار اشاریہ مضامین اقبال شناسی (بحوالہ کتب):** قمر عباس، صفحات ۳۹۷، پتہ: ۱۶۶ میکلوڈ روڈ، لاہور۔ قیمت ۷۵ روپے

۳- **اقبال تشکیلی دور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۳ء:** خرم علی شفیق، صفحات ۵۵۷، پتہ: میکلوڈ روڈ، لاہور۔ قیمت ۵۰۰ روپے

۴- **جامع الحقوق:** مولانا قمرالزماں، صفحات ۸۸، پتہ: مکتبہ دارالمعارف، الہ آباد، ۶۳۹ وصی آباد الہ آباد، یوپی ۲۱۱۰۰۳۔ قیمت ۲۵ روپے

۵- **نشیب وفراز اور سفرنامہ:** مولانا ڈاکٹر مختار احمد اصلاحی، صفحات ۳۰۴، پتہ: مجلس دعوت القرآن، جین پور، اعظم گڈھ، یوپی۔ قیمت ۱۵۰ روپے

۶- **آئینہ کلام نبوتؐ:** مولانا ڈاکٹر مختار احمد اصلاحی، صفحات ۱۸۷، پتہ: مجلس دعوت القرآن، جین پور، اعظم گڈھ، یوپی۔ قیمت ۷۰ روپے

۷- **مرزا عبدالقادر بیدل حیات اور کارنامے:** ڈاکٹر سید احسن الظفر، صفحات ۲۰۷، پتہ: رام پور رضا لائبریری، رام پور، ۲۴۴۹۰۱۔ قیمت ۶۵۰ روپے

۸- **جامع النقول فی اسباب النزول (جلد اول):** مولانا محمد ادریس پٹیل فلاحی ورٹھی، صفحات ۷۰۷، پتہ: ادارہ فیض دارین، ورٹھی، وایا کیم ضلع سورت، گجرات، انڈیا۔ قیمت درج نہیں۔

۹- **اخترالایمان کی دس نظمیں--ایک تجزیاتی مطالعہ:** محمد آصف زہری، صفحات ۲۰۲، پتہ: آئیڈیا کمیونیکیشن ۵۵۲ بی/۲۲، ذاکر نگر نئی دہلی۔ قیمت برائے طلبہ ۱۵۰ روپے اور برائے لائبریری ۲۰۰ روپے۔

۱۰- **فتح اور غلبے کا قرآنی تصور:** استاد محمد محمد الصلابی، مترجم مسیح الزماں فلاحی ندوی، صفحات ۲۵۶، پتہ: مدھر سندیش سنگم، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵۔ قیمت ۱۰۰ روپے۔

۱۱- **حریر دورنگ:** مترجم عقیل احمد، صفحات ۲۰۴، پتہ: انشاء پبلیکیشنز، کلکتہ، ۲۰۴۔ قیمت درج نہیں۔

۱۲- **افکار عالم فکر اسلام کی روشنی میں (جلد دوم):** مولانا اسیر ادروی، صفحات ۴۱۶، پتہ: شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیوبند۔ قیمت درج نہیں۔